خونی پروگرام
اشتیاق احمد

طابع : اشتیاق احمد، نقش محمد
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
خوشنویس : مہر عبدالستار راجہ جنگ
قیمت :

مکتبہ اشتیاق راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

دو باتیں

یہ خونی پروگرام ہے۔ بہت خطرناک ہے۔ ذرا سنبھل کر پڑھیے گا۔ کہیں آپ گھبرا نہ جائیں، بوکھلا نہ جائیں!

اس بار انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کا ساتھ نہیں دے سکے۔ اس طرح بہت سے پڑھنے والوں کی یہ خواہش پوری ہو جائے گی کہ ان تینوں کا کوئی ایسا کارنامہ بھی ہونا چاہیے، جو انہوں نے انسپکٹر جمشید کی مدد کے بغیر حل کیا ہو؛ چنانچہ اس بار ناول میں انسپکٹر جمشید ہیں بھی اور نہیں بھی۔ آپ کہہ اٹھیں گے، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے، تو جناب آپ پڑھ کر دیکھیں، ممکن اور ناممکن والی بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔

شوکی سیریز کا استقبال بھی خوب رہا۔ امید نہیں تھی کہ اسے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ چلیے اس سیریز سے آپ کی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اور آپ لوگوں کی صدا کیا ہے۔ یہی تو چاہتے تھے آپ۔ لیکن اس طرح آپ نے مجھے الجھنوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ سوچا یہ تھا، اب میں ہر ماہ صرف تین ناول لکھا کروں گا، اور ایک پرانا لگا دیا کروں گا، لیکن شوکی سیریز کا اصرار اس قدر بڑھا کہ مجھے ہار مانتے ہی بن پڑی اور اب پھر سے ہر ماہ چار ناول لکھنے پڑ رہے ہیں۔ دیکھیے میں کہاں تک اس بار کو اٹھا پاتا ہوں۔ نظر کمزور ہونا شروع ہو گئی ہے اور میں نے زندگی میں پہلی بار ابھی پچھلے ماہ عینک لگوائی ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

دعاگو

اس ناول کے آخر میں انعامی سوال کا جواب اور انعام پانے والوں کی تفصیل دی جا رہی ہے۔

ان دنوں عام شکایت یہ ہے کہ آپ کو اپنے خطوط کے جوابات بہت دیر سے ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں کوشش کافی کی جاتی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں زیادہ تر جھنگ صدر میں دن گزارتا ہوں، وہیں رہ کر ناول لکھتا ہوں، جب کہ لاہور میں ایک ماہ میں صرف چار پانچ دن گزارتا ہوں۔ آپ کی شکایات کے ازالے کے لیے میں نے سوچا ہے کہ اب آپ مجھے جھنگ کے پتے پر خط لکھا کریں، تاکہ آپ کو جلد جواب مل جایا کرے۔ کاروباری حضرات بدستور مکتبہ اشتیاق کے پتے پر ہی خط لکھتے رہیں گے۔ پتا یہ ہے:

اشتیاق احمد۔ معرفت حاجی مشتاق احمد بازار لوہاراں جھنگ صدر

ایک تکلیف دہ مسئلہ یہ ہے کہ خطوط کے جوابات کے لیے وہی لوگ زور شور سے مطالبہ کرتے ہیں اور برا بھلا بھی کہتے ہیں جو اپنے خط پر پتا نہیں لکھتے۔

اشتیاق احمد

عجیب غریب درخواست

انسپکٹر جمشید کا چپراسی دفتر میں داخل ہوتے ہوئے بولا:

"سر، ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کا نام سر کوٹی والا ہے۔"

"کیا کہا، سر کوٹی والا؟" انسپکٹر جمشید حیرت زدہ لہجے میں بولے، اکرام بھی بھونچکا رہ گیا۔

سر کوٹی والا ملک کی بہت بڑی شخصیت تھی۔ تمام وزراء اور صدر مملکت تک ان کی عزت کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ملک کے لیے بہت قربانیاں دی تھیں۔ جب بھی ملک پر کوئی مشکل وقت پڑا، وہ آگے آگئے اور ملک کے لیے اپنی تمام تر خدمات پیش کر دیں۔ دولت کا ان کے پاس شمار ہی نہیں تھا۔ وہ آج تک اپنی دولت کو گن نہیں سکے تھے۔ بنکوں میں موجود رقوم کو اگر گن بھی لیا جاتا تو بھی یہ ان کی دولت کا صحیح جائزہ نہیں کہلا سکتا تھا، کیونکہ ہیرے، جواہرات، نوادرات، موتی اور بے شمار زرخیز زمینیں بھی ان کی ملکیت میں تھیں، جن کا حساب کتاب

کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، لہذا وہ آج تک اس چکر میں نہیں پڑے
تھے کہ ان کے پاس کتنی دولت ہے۔ وہ تو بس اس دولت کو ملک اور
قوم پر خرچ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ کتنے ہی غریب، یتیم اور بیوائیں
ان کے وظیفوں پر پل رہے تھے — کتنے ہی رفاہی ادارے ان کی امداد
پر چل رہے تھے۔ یہی نہیں، ملک کے بڑے بڑے مسائل میں بھی وہ
مددگار ثابت ہوتے تھے اور یہی سر کوٹی والا اس وقت انسپکٹر جمشید کے
دفتر کے باہر موجود تھے۔

"ٹھہرو، میں انہیں خود اندر لاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے — اکرام بھی تیزی سے اٹھا۔
مزے کی بات یہ تھی کہ آج تک انسپکٹر جمشید کو سر کوٹی والا سے ملاقات
کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے تو انہیں کسی تقریب میں بھی نہیں
دیکھا تھا — وہ تقریبات میں یوں بھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ آج تک
ان کی کوئی تصویر اخبار میں بھی نہیں چھپی تھی — وہ اخباری رپورٹروں کو
اپنی تصویر اتارنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ دراصل ان کا کہنا یہ
تھا کہ میں یہ کام دکھاوے کے لیے نہیں کرتا۔ اپنے اللہ کو راضی کرنے
کے لیے کرتا ہوں، پھر تصویر کی کیا ضرورت ہے — تقریبات میں وہ اس
لیے شریک نہیں ہوتے تھے کہ اس طرح نماز باجماعت ادا نہیں کر
سکتے تھے اور شاید یہی وجوہات تھیں کہ اللہ تعالیٰ بھی انہیں بے حساب
دے رہا تھا۔ شہر میں ان کی ایک بہت بڑی فلور مل تھی — اتنی بڑی

کہ پورے ملک میں اس کے مقابلے کی کوئی مل نہیں تھی۔ مل میں
ہزاروں مزدور کام کر رہے تھے اور سب کے سب خوشحال زندگی گزار
رہے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ سر کوٹی والا نے ان کی تنخواہیں مقرر
کرنے میں انتہائی فراخ دلی سے کام لیا تھا — ان کے دلوں سے ان
کے لیے ہر وقت دعائیں نکلتی تھیں۔

دونوں باہر نکلے اور پھر حیران رہ گئے — دروازے کے باہر ایک
تنک منک سا آدمی شلوار قمیص پہنے کھڑا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں
ایک چھڑی بھی تھی، جس سے اس نے سہارا لے رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں
پر عینک تھی، چہرے پر داڑھی تھی، جس میں نصف سے زیادہ بال
سفید تھے۔ پچاس سال عمر تو ضرور رہی ہوگی۔

دونوں نے ادھر ادھر دیکھا، لیکن کوئی اور شخص وہاں نظر نہ
آیا —

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں جمشید صاحب، میں ہی کوٹی والا
ہوں۔" اس تنک منک آدمی نے بجھی بجھی مسکراہٹ سے کہا۔

"اوہ —" دونوں کے منہ سے نکلا — انہیں سر کوٹی والا کے اس
قدر سادہ ہونے کی امید نہیں تھی — دونوں نے ان سے مصافحہ کیا
اور پھر اندر لے آئے —

"تشریف رکھیے جناب، آپ نے کیوں زحمت کی۔ فون کر کے مجھے
بلا لیا ہوتا۔ میں فوراً پہنچ جاتا۔"

"بات یہ ہے جمشید صاحب، ہمیشہ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں کبھی چل کر پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"جی بجا فرمایا آپ نے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اکرام کو اشارا کیا کہ وہ چائے کا بندوبست کرے اور اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے میز کے پائے میں لگا بٹن تین بار دبا دیا۔ تین بار دبانے کا مطلب یہ تھا کہ چائے بہت جلد اور نفیس ترین بھیجی جائے۔

"میں بہت پریشان ہوں۔ چند روز پہلے مجھے قطعاً کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میں نے بہت غور کیا کہ اس سلسلے میں کیا کیا جائے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر ذہن آپ کی طرف گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میری پریشانی پر لگا کر اڑ گئی ہو؛ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا احساس تھا۔ پریشانی تو ابھی تک اپنی جگہ پر موجود ہے۔" اتنا کہہ کر سر کوٹلی والا خاموش ہو گئے۔

"اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں آپ کی پریشانی دور کر سکوں گا، تو یہ میری خوش قسمتی ہے۔ فرمایئے، معاملہ کیا ہے؟"

"بات یہ ہے کہ میں ایک پختہ قسم کا مسلمان ہوں۔ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ایمان رکھنے والا، احادیث پر عمل کرنے والا، میں موت سے نہیں ڈرتا، لیکن میں حرام موت کسی قیمت پر بھی نہیں مرنا چاہتا۔"

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"مم، میں، میں خودکشی نہیں کرنا چاہتا۔" وہ بولے۔ انسپکٹر جمشید اور اکرام کی حیرت کا کیا پوچھنا۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بھلا آپ خودکشی کیوں کرنے لگے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اسی وقت چائے آ گئی اور گفت گو کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ آخر جب ان تینوں کے سامنے چائے رکھی جا چکی تو سر کوٹلی والا نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا:

"چائے تو بہت پر لطف ہے کمال ہے، میں نے اپنے گھر میں تین بہت ہی خاندانی قسم کے باورچی رکھے ہوئے ہیں، لیکن وہ مجھے آج تک اتنی نفیس چائے نہیں پلا سکے۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں اس چائے کے بنانے والے کو آپ کی خدمت میں دیے دیتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید دھیرے سے مسکرائے۔

"ارے نہیں، یہ تو خیر زیادتی ہوگی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں حرام موت مرنا نہیں چاہتا، خودکشی کرنا نہیں چاہتا۔"

"خدانخواستہ آپ ایسا کریں بھی کیوں۔" وہ بولے۔

"یہی تو مصیبت ہے۔ میرے نجومی کا کہنا ہے کہ میں ایک دو روز کے اندر اندر خودکشی کر لوں گا۔" انہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"نجومی کا کہنا ہے۔" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"ہاں' وہ واقعی بہت ماہر نجومی ہے۔ آج تک اس نے جتنی بھی باتیں مجھے بتائیں' وہ سبھی ہو کر رہیں۔ مثلاً ایک روز اس نے مجھے بتایا کہ میری بلی فلاں روز مر جائے گی۔ اس تاریخ کو بلی مر گئی۔ ایک روز اس نے بتایا کہ فلاں تاریخ کو میرا طوطا بھی مر جائے گا اور طوطا بھی مر گیا۔ ایک دن کہنے لگا کہ میرے بیٹے کا فلاں تاریخ کو ایکسیڈنٹ ہو گا' لیکن اس ایکسیڈنٹ میں میرے بیٹے کو کوئی چوٹ نہیں آئے گی۔ میں نے اپنے بیٹے کو اس روز گھر سے باہر ہی نہ جانے دیا' لیکن اسے اپنے کمرے میں ہی حادثہ پیش آ گیا۔ کمرے میں ایک سانپ کسی سمت سے نکل آیا۔ وہ اس سے ڈر کر میز پر چڑھ گیا۔ سانپ دراصل دروازے کی طرف تھا' ورنہ وہ دروازے سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ سانپ کا رخ میز کی طرف ہوا تو اس نے ڈر کر چھلانگ لگا دی' لیکن گھبراہٹ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کے ساتھ میز بھی الٹ گئی اور اس پر گری۔ سانپ تو کھڑکی کی طرف سے باہر نکل گیا؛ البتہ میز کے گرنے سے اسے معمولی چوٹیں ضرور آئیں اور اس طرح نجومی کی یہ پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"اور اب نجومی صاحب یہ پیش گوئی کر رہے ہیں کہ آپ ایک دو روز میں خودکشی کر لیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں' اس کا کہنا یہی ہے۔"

"پہلے تو آپ مجھے اس نجومی کے بارے میں بتائیے۔ وہ کون ہے۔ آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟"

"وہ اس شہر کا سب سے مشہور نجومی ہے۔ مستقبل کا حال جاننے کے خواہش مند لوگوں کی اس کے پاس بہت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ ایک زمانہ تھا' جب وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لوگوں کی قسمت کا حال بتایا کرتا تھا' پھر اس نے ایک دکان کر لی۔ کچھ عرصہ گزرنے پر اس نے اپنا باقاعدہ دفتر بنا لیا اور اس کے بھی کچھ عرصہ بعد اس نے ایک کوٹھی بنا لی۔ اب کوٹھی کے ایک کمرے میں اس نے اپنا دفتر بنا رکھا ہے۔ قسمت کا حال پوچھنے والے اب وہیں جاتے ہیں اور گھنٹوں اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ اس کی بتائی ہوئی باتیں آج تک غلط ثابت نہیں ہوئیں۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"سوال یہ ہے کہ آپ اس تک کیسے پہنچ گئے۔ کیا آپ کو بھی مستقبل کا حال معلوم کرنے سے دلچسپی ہے۔ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ایمان رکھنے والے تو مستقبل سے بالکل بے نیاز رہتے ہیں۔"

"آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ میں نے کبھی کسی نجومی کی خدمات حاصل نہیں کیں' لیکن اگر کوئی شخص زبردستی پلے پڑ جائے اور اس

کی پہلی ہی بات درست ثابت ہو جائے تو انسان اس کی بات سُنے بغیر نہیں رہ سکتا۔" انھوں نے کہا۔

"ذرا وضاحت فرمائیے — آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ میں کبھی اس کے پاس نہیں گیا — اس کے ہی کیا، کبھی بھی کسی نجومی وغیرہ کے پاس نہیں گیا — ایک روز ایک عجیب سے حلیے کا آدمی مجھ سے ملاقات کے لیے آیا — میں ہر آنے والے سے ضرور ملتا ہوں، کیونکہ بہت سے ضرورت مند میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ اگر میں ملے بغیر انہیں لوٹا دوں تو یہ بہت بڑی زیادتی ہوگی — ہاں تو میں اس کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کا سر انڈے کے چھلکے کی طرح تھا، یعنی اس کے سر پر ایک بال بھی نہیں تھا — آنکھیں بڑی، باہر کو اُبھری ہوئی اور سرخ تھیں — جسم سرخ و سفید تھا — ہاتھوں اور بازوؤں پر گھنے بال تھے۔ وہ گہرے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا — اس کی انگلیوں میں زمرّد کی انگوٹھیاں تھیں — جسم سے ایک عجیب سی خوش بو اٹھ رہی تھی — آتے ہی اس نے کہا:

'سر کوٹلی والا! میں کبھی کسی کے گھر نہیں جاتا — آپ کے گھر بھی صرف اس لیے آیا ہوں کہ آپ اس ملک اور قوم کے ہمدرد ہیں، مددگار ہیں — آپ اپنی بلی کا ذرا خاص خیال رکھیے۔ میرے خیال میں آنے والا ہفتے کا روز بلی کے لیے بہت مشکل کا دن ہے۔'

'کیا مطلب، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟' میں حیران رہ گیا۔

'میرا علم کہتا ہے کہ اس روز بلی مر جائے گی، زندہ نہیں بچے گی۔ لیکن میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے، پھر بھی میں آپ کو اطلاع دینے چلا آیا ہوں۔ اگرچہ میں خود کسی کے پاس نہیں جاتا — لوگ ہی میرے پاس آتے ہیں۔'

'حیرت ہے، گھر بیٹھے آپ کو میری بلی کے بارے میں کس طرح معلوم ہو گیا، جو لوگ آپ کے پاس آتے ہیں، ان کے تو آپ ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتاتے ہوں گے یا زائچہ وغیرہ کھینچتے ہوں گے، لیکن میری بلی کے بارے میں آپ کو کیسے علم ہو گیا۔' میں نے حیران ہو کر پوچھا —

'اس طرح کہ علم نجوم کے علاوہ بھی میں کچھ علوم جانتا ہوں، انہیں آپ پر اسرار علوم کہہ لیں — فرصت کے اوقات میں میں ان سے کام لیتا ہوں۔ یوں کہہ لیں کہ یہ میرا وقت گزارنے کا مشغلہ ہے۔'

'بہت اچھا، میں بلی کا خاص خیال رکھوں گا۔' آخر میں نے کہا اور نجومی چلا گیا۔ اس نے مجھ سے کسی معاوضے کے لیے بھی نہیں کہا۔ میں نے کوئی توجہ نہ دی، کیونکہ مذہبی لوگ ایسی باتوں پر توجہ دیا بھی نہیں کرتے — ہفتے کا دن آیا تو مجھے یاد بھی نہ رہا کہ کوئی نجومی بلی کے بارے میں کچھ کہہ گیا تھا، وہ تو مجھے اس وقت یاد آیا، جب میرے ملازم نے آکر مجھے بتایا کہ بلی مری پڑی ہے۔ یہ سنتے ہی مجھے اچانک نجومی کی باتیں یاد آئیں اور میں حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں

نے جا کر بلی کے مردہ جسم کو دیکھا۔ اس کا جسم بالکل سرد تھا، اگرچہ ابھی اکڑنا شروع نہیں ہوا تھا۔ جسم پر کوئی ایسے نشانات نہیں تھے، جس سے یہ ثابت ہوتا کہ اسے کسی نے ہلاک کیا ہے۔ آخر میں نے اپنے باغ کے کونے میں اسے دفن کرا دیا۔ بلّی سے مجھے بہت پیار تھا، وہ بھی مجھ سے بہت ہل گئی تھی، لہٰذا میں کئی روز تک بہت اداس رہا۔ پندرہ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ وہی نجومی پھر مجھ سے ملنے آیا۔ میرے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی طنزیہ انداز میں بولا:

'اب تو آپ کو یقین آ گیا ہو گا کہ میرا علم اتنا گیا گزرا نہیں ہے۔'

'ہاں، مجھے بہت افسوس ہے۔ میں نے آپ کی باتوں پر اس روز توجہ نہیں دی تھی۔ بلّی اسی ہفتے کے روز مر گئی، جس روز کے لیے آپ نے بتایا تھا، لیکن میں کر بھی کیا سکتا۔ آخر میں بلی کی موت کو کس طرح روک سکتا تھا۔'

'یہ بات بھی ٹھیک ہے، مجھے افسوس ہے، اس بار بھی میں آپ کے لیے ایک بُری خبر لے کر آیا ہوں۔' نجومی نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

'جی، کیا مطلب؟' میں نے پریشان ہو کر کہا۔

'بدھ کے دن آپ کا طوطا مر جائے گا۔'

'نہیں۔' میں چلّا اٹھا۔

'مجھے افسوس ہے، ستارے یہی کہتے ہیں۔'

'اُف خدا، یہ سب کیا ہے، یہ آخر کیا ہو رہا ہے۔' میں نے تقریباً چلّا کر کہا۔

'بس میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ طوطے کا خاص خیال رکھیے۔ اس کی خوراک بہت اچھی ہونی چاہیے اور صدقہ خیرات سے بھی اس کی مدد کیجیے۔'

'بہت بہتر، میں ضرور ایسا ہی کروں گا اور ہاں آپ کو بھی تو مجھے فیس ادا کرنی چاہیے۔ آپ دوبار میرے لیے تکلیف کر چکے ہیں۔'

'شکریہ، مجھے امید تھی کہ آپ میرے حق کا احساس کریں گے۔' نجومی نے خوش ہو کر کہا۔

میں نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر اسے دیے اور وہ شکریہ ادا کر کے اٹھ گیا۔ میں نے اپنے ملازم کو طوطے کے بارے میں اچھی طرح ہدایات دیں۔ خود بھی اس کا خیال رکھا، لیکن بدھ کی صبح کو وہ اپنے پنجرے میں مردہ ملا۔ میری حیرت اب انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے طوطے کو بھی بلّی کے پہلو میں دفن کرا دیا۔ طوطے کے مرنے کا مجھے اور بھی دُکھ ہوا۔ بہت پیاری پیاری باتیں کیا کرتا تھا۔ دونوں سے رات گئے تک میں دل بہلاتا تھا۔ بلّی تو سوتی بھی میرے بستر پر تھی اور طوطے کا پنجرہ میرے کمرے کے بیچوں بیچ ایک تپائی پر رکھا رہتا۔ بلّی نے کبھی طوطے کو نہیں گھورا تھا؛ گویا اس

میں بھی اتنی سمجھ تھی کہ یہ اسی کی طرح پالتو طوطا ہے۔ دونوں کی موت نے مجھے حد درجے غمگین کر دیا۔ ابھی ایک ہفتہ مکمل طور پر نہیں گزرا تھا کہ نجومی کی صورت پھر دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

'خدا کے لیے اس بار مجھے کوئی اور بُری خبر نہ سنائیے گا میں پہلے ہی بلی اور طوطے کے لیے پریشان ہوں۔'

'تو طوطا بھی چل بسا ہے؟' اس کے منہ سے نکلا۔

'ہاں، اور اسی روز، جس روز کے لیے آپ نے پیشین گوئی کی تھی۔'

'میں کیا کروں، یہ میرا علم ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں تو میں اسی طرح چلا جاتا ہوں اور جو بات آپ کو بتانے آیا ہوں، نہیں بتاتا، لیکن ہونے والی بات تو ہو کر رہے گی۔ آپ سُنیں یا نہ سُنیں۔'

'کیا مطلب؟ کیا اس مرتبہ پھر آپ کوئی بُری خبر لے کر آئے ہیں۔' میں نے گھبرا کر کہا۔

'جی ہاں، آئندہ اتوار کا دن آپ کے بیٹے کے لیے بہت منحوس ہے۔ ہو سکتا ہے، اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جائے یا اسے کوئی اور حادثہ پیش آ جائے۔ اس لیے اتوار کے روز اس کا خاص خیال رکھیے گا۔ ہو سکے تو اسے گھر سے باہر نہ جانے دیجیے گا۔ خیال ہے وہ زخمی ضرور ہوگا۔'

'اُف خدا، تو میرا بیٹا بھی.....' میں جملہ مکمل نہ کر سکا۔

نجومی کے منہ سے بھی کوئی لفظ نہ نکلا۔ اس کے چہرے پر بے چارگی کے آثار پھیل گئے، جیسے کہہ رہا ہو، آخر میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ ہونے والی بات کو ہونے سے کس طرح روک سکتا ہوں، پھر میں نے اسے پانچ سو روپے دیے۔ روپے لیتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنے بیٹے زبیر سلیم کو نجومی کی پیشین گوئی کے بارے میں بتایا، وہ بہت ہنسا اور کہنے لگا:

'ابا جان، اب آپ نجومیوں کی باتوں پر بھی دھیان دینے لگے ہیں۔'

'لیکن بھئی اس کی دو پیشین گوئیاں بالکل درست نکلی ہیں۔ بلی اور طوطا عین اسی روز مرے، جس روز کے لیے اس نے کہا تھا:

'میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔' اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

'پھر میں اتوار کے دن تمہیں گھر سے باہر نہیں جانے دوں گا۔' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اتوار کے روز زبیر سلیم باہر جانے لگا تو میں نے اسے روک دیا، پھر احتیاط کے خیال سے اسے اس کے کمرے میں بند کر دیا، لیکن ہوا یہ کہ اس کے کمرے میں سانپ نکل آیا اور اس سے بچنے کی کوشش میں وہ میز کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس طرح اس کی ٹانگیں زخمی ہوئیں۔ یہ ہیں اس نجومی کے حالات۔ کل وہ پھر آیا تھا اور اس بار اس نے

کہا ہے کہ میں ایک دو روز تک خودکشی کر لوں گا۔ انسپکٹر صاحب، میں موت سے نہیں ڈرتا، لیکن میں حرام موت نہیں مرنا چاہتا۔ خدا کے لیے مجھے حرام موت سے بچا لیجیے۔"

یہاں تک کہہ کر سرکوٹی والا خاموش ہو گئے اور انسپکٹر جمشید سکتے کے عالم میں رہ گئے، کیونکہ اتنی عجیب و غریب درخواست ان سے آج تک کسی نے بھی نہیں کی تھی۔

خاص وجہ

کمرے میں موت کی خاموشی طاری تھی۔ اکرام کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات تھے۔ انسپکٹر جمشید سرکوٹی والا کے چہرے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد گویا ہوئے:

"کیا اس نے یہ بتایا ہے کہ آپ خدانخواستہ خودکشی کس طرح کریں گے؟"

"نہیں، اس نے تفصیل نہیں بتائی۔"

"اور آپ اس کی پیشین گوئی سے خوفزدہ ہیں؟"

"ہاں، اس لیے کہ اس کی تین پیشین گوئیاں بالکل درست ثابت ہوئی ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"ہوں، فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا معاملہ ہے؛ تاہم میں اسی وقت سے اس کیس پر کام شروع کیے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک سفید کاغذ پر چند ہدایات لکھ کر اکرام کو دیں۔ اکرام نے ان ہدایات کو پڑھا اور یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل

گیا۔

"اوکے سر۔"

اس کے بعد انہوں نے گھر فون کیا۔ دوسری طرف سے بیگم جمشید کی آواز سنائی دی:

"بیگم، محمود اور فاروق آئیں تو آج انہیں پارک نہ جانے دینا۔"

"کیوں، خیر تو ہے۔ آج پارک میں ان کے لیے کوئی خطرہ ہے کیا؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے ان سے ایک کام لینا ہے۔"

"جی بہتر۔" انہوں نے کہا۔ ریسیور رکھ کر انسپکٹر جمشید سرکوٹلی والا کی طرف مڑے:

"معاملہ کافی پراسرار ہے۔ بغور تفتیش کرنا ہوگی۔ آپ گھر تشریف لے چلیے۔ میں شام پانچ بجے کے بعد کسی وقت حاضر ہوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ، میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے جناب، اس ملک اور قوم کو ابھی آپ جیسے لوگوں کی بہت ضرورت ہے۔"

سرکوٹلی والا نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید گیٹ تک ان کے ساتھ آئے۔ واپس لوٹے تو اکرام کمرے میں موجود تھا۔

"نگرانی پر حوالدار محمد حسین کو مقرر کر دیا ہے۔"

"ٹھیک کیا۔ تمہارا اس معاملے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"میرا خیال یہ ہے کہ کیس حیرت انگیز ہے۔"

"اور میرا خیال یہ ہے کہ اس سے زیادہ عجیب کیس آج تک میرے پاس نہیں لایا گیا۔ میرا خیال ہے، ہمیں بہت دوڑ دھوپ کرنا پڑے گی۔ اور ہاں، سرکوٹلی والا کی کوٹھی کی نگرانی بھی اسی وقت سے شروع کرادو۔ کوٹھی کے ایک ایک آدمی کی نگرانی ہونی چاہیے۔"

"جی بہتر، میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں، بلکہ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں بھی ڈیوٹی کے بعد حویلی کے آس پاس موجود رہوں۔"

"یہ اور بھی مناسب رہے گا۔" انہوں نے کہا۔

ٹھیک پانچ بجے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ دفتر سے نکل کر جیپ میں بیٹھے اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے، لیکن ابھی سو میٹر فاصلہ بھی طے نہیں کیا ہوگا کہ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ایک سفید کار برابر ان کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ انہوں نے رفتار کم کر دی۔ سفید کار کی رفتار بھی کم ہو گئی۔ تنگ آ کر انہوں نے رفتار بڑھا دی۔ ساتھ ہی سفید کار کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ اب تو ان پر جھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ آخر انہوں نے جیپ سڑک کے کنارے کرتے ہوئے روک

دی۔ سفید کار کی رفتار پہلے تو کم ہوئی اور پھر وہ بھی رک گئی۔ انسپکٹر جمشید باہر نکلے اور اس کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ سفید کار کا ڈرائیور اپنی سیٹ پر پورے اطمینان سے بیٹھا رہا، یہاں تک کہ وہ اس کے نزدیک پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا، یہ ایک نوجوان آدمی تھا۔ پچیس سال سے زیادہ عمر نہیں رہی ہوگی۔ چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ آنکھوں میں شوخی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ سٹیرنگ پر تھے اور نظریں سامنے۔ یعنی جیپ کی طرف۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے پرسکون آواز میں کہا۔ جیپ سے اترتے وقت وہ اپنی جھلاہٹ پر قابو پا چکے تھے۔

"جی، مجھ سے کچھ فرمایا آپ نے؟"

"اس کار میں آپ کے سوا تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔" وہ بولے۔

"لیکن میں نے تو آپ سے کچھ بھی نہیں کہا، پھر آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ آپ میرا تعاقب کر رہے ہیں۔"

"ارے، کیا واقعی، میرا خیال ہے آپ کو ضرور خوش فہمی ہوئی ہے۔" وہ شریر انداز میں بولا۔

"خوش فہمی۔ شاید آپ غلط فہمی کہنا چاہتے ہیں۔"

"جی نہیں، خوش فہمی۔ بعض لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ لوگ ان کا تعاقب کرتے رہتے ہیں؛ حالانکہ ایسی کوئی

بات نہیں ہوتی۔ میں تو دراصل اس کار کا جائزہ لے رہا ہوں۔۔ دوسرے لفظوں میں اس کی ٹرائی لے رہا ہوں۔ میرا ارادہ اس کار کو خریدنے کا ہے۔ بہت سستی مل رہی ہے۔ اسی لیے میں اسے کبھی تیز اور کبھی آہستہ چلا کر دیکھ رہا ہوں۔ آپ خیال کر بیٹھے کہ میں آپ کا تعاقب کر رہا ہوں۔"

"اوہو، اگر یہ بات ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ ویسے آپ کا نام کیا ہے؟"

"کیوں جناب، میں آپ کو اپنا نام کیوں بتاؤں۔" اس نے تنک کر کہا۔

"اگر آپ نام بتانا پسند نہیں کرتے تو رہنے دیجیے۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔" وہ بولے۔

"ٹھیک ہے، اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟" نوجوان نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مجھ سے جو گفتگو آپ کو کرنا تھی، وہ تو آپ کر چکے، اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔"

"کچھ بھی نہیں، بس واپس جاؤں گا۔" انہوں نے بھی مسکرا کر کہا۔ اور سیدھے کھڑے ہو گئے، پھر نوجوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے:

"آپ کی ٹرائی مکمل ہو چکی ہے یا ابھی جاری رہے گی۔"

"ابھی تو میں بہت دیر تک ٹرائی لوں گا جناب، آخر یہ ایک کار کی خرید و فروخت کا معاملہ ہے۔"

"ہاں واقعی، شوق سے ٹرائی لیجیے جناب۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جیپ کی طرف چل پڑے۔ ان کے چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ کار کا نمبر وہ نزدیک پہنچتے ہی نوٹ کر چکے تھے۔ جیپ میں بیٹھنے کے بعد پہلے انہوں نے کار کا نمبر نوٹ بک میں لکھا اور پھر جیپ سٹارٹ کر دی۔ مڑ کر دیکھا تو سفید کار بھی حرکت میں آ چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ سفید کار بھی آہستہ رفتار سے آگے آنے لگی۔ لیکن پھر ایسا لگا جیسے وہ لڑکھڑانے لگی۔ انہوں نے آئینے میں نوجوان کا رنگ اڑتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔

○

"ایک بات میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں۔" فاروق نے مکا ہوا میں لہرایا۔

"جب کہ شرط لگانا حرام ہے۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"خیر، تو چلو یوں سہی۔ ایک بات میں شرط لگائے بغیر کہہ سکتا ہوں۔" فاروق نے گویا اپنی غلطی تسلیم کی، جملہ کہتے وقت وہ مسکرایا بھی۔

"چھوڑو یار، بات کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" محمود نے منہ بنایا۔

"یہ کہ ابا جان نے کسی خاص وجہ سے ہمیں پارک جانے سے روکا ہے۔"

"یہ اندازہ تو کوئی احمق بھی لگا سکتا ہے۔" فرزانہ جل کر بولی۔

"لیکن۔" فاروق لیکن پر زور دے کر بولا: "وہ خاص وجہ یہ نہیں ہو سکتی کہ پارک میں ہمارے لیے کوئی خطرہ ہے۔"

"تو پھر، تمہارے خیال میں کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" محمود کو اس کی باتوں میں دل چسپی محسوس ہونے لگی۔

"وجہ صرف یہ ہے کہ پارک میں چونکہ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا، اسی لیے انہوں نے ہمیں وہاں جانے سے روک دیا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" فرزانہ نے جھلا کر کہا: "میں نے آج تک اتنی بے وقوفانہ بات کبھی نہیں سنی۔"

"ابھی جب میں اپنی بات کی تشریح کروں گا تو پھر یہ بات تمہیں عقل مندانہ محسوس ہونے لگے گی۔ اور اس وقت تمہیں اپنے جملے پر افسوس ہوگا، وہ بھی بلا کا افسوس۔"

"لو اب افسوس بھی بلا کا ہونے لگا۔" فرزانہ نے محمود کی طرف تائید طلب انداز میں دیکھا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ابا جان دراصل ہمیں کسی خطرے والی جگہ بھیجنا چاہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کوئی کیس ہمارے پلے پڑنے

والا ہے۔" فاروق شریر انداز میں گویا ہوا۔

"توبہ ہے، بات کو اس قدر گھما پھرا کر کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔" فرزانہ نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور محمود نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا:

"ہیلو، میں محمود بول رہا ہوں۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"انسپکٹر جمشید سے۔" دوسری طرف سے عجیب سی آواز میں کہا گیا۔

"وہ ابھی گھر نہیں پہنچے۔ غالباً راستے میں ہوں گے۔" محمود نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"جوں ہی وہ گھر آئیں، ان سے کہہ دیجیے گا، امجدالے کریم صاحب نے خودکشی کر لی ہے۔ فوراً ان کی کوٹھی پہنچ جائیں۔"

"آپ کون صاحب ہیں، اپنا نام نوٹ کرا دیں۔"

"میں امجدالے کریم صاحب کا سیکرٹری گیلانی رضا بول رہا ہوں۔ ان کی میز پر ایک کاغذ ملا ہے اور اس پر ایک نام لکھا ہے۔"

"کس کا نام؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"انسپکٹر جمشید کا۔ یہ نام پڑھ کر ہی میں نے یہاں فون کیا ہے۔ شاید امجدالے کریم صاحب سے انسپکٹر جمشید کے کچھ خاص تعلقات

ہوں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ امجدالے کریم کون تھے؟" محمود نے پوچھا۔

"ارے، آپ کو یہ بھی نہیں معلوم، وہ سیکرٹری تھے وزارت خارجہ کے۔"

"اوہو، اچھا۔" محمود کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا اور دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ اس نے بھی ریسیور رکھتے ہوئے دونوں کو گفت گو کی تفصیل بتائی۔

"چلو شکر ہے، انہوں نے خودکشی کی۔ اگر قتل ہوئے ہوتے تو ایک عدد کیس اور پلے پڑ جاتا۔" فاروق نے لمبا سانس کھینچا۔

"یار عجیب کام چور ہو۔ خودکشی جیسی حرام حرکت پر خدا کا شکر ادا کر رہے ہو۔ دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"واقعی، بڑی شرم کی بات ہے۔" فرزانہ نے بھی محمود کا ساتھ دیا۔

"سوری، مجھے خیال نہیں رہا۔ مجھے اس بات پر خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔" فاروق سنجیدہ ہو گیا۔

"لیکن بھئی، ابا جان کو تو اس وقت تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔" محمود پریشان ہو کر بولا۔

"ایک آدھ منٹ کی دیر تو ہو ہی سکتی ہے۔ بس گھنٹی بجنے

ہی والی ہے۔“ فاروق بولا۔

” اور ہم نے گیلانی رضا سے اجلال کریم کا فون نمبر معلوم ہی نہیں کیا۔ اب اگر ان کے نمبر ابا جان کے پاس نہ ہوئے تو ڈائرکٹری میں دیکھنا پڑیں گے اور اس طرح وقت ضائع ہوگا۔“ فرزانہ نے دُور کی سوچی۔

” تو ہم پہلے ہی تلاش کرکے رکھ لیتے ہیں۔“ محمود نے کہا اور ڈائرکٹری اٹھالی۔ عین اسی وقت گھنٹی بجی، لیکن انداز انسپکٹر جمشید کا نہیں تھا۔ محمود اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ فاروق اور فرزانہ بھی بیٹھے نہ رہ سکے۔ وہ بھی اس کے پیچھے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ کھولنے پر ان کی نظر ایک نوجوان آدمی پر پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک شوخ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

” فرمائیے جناب، ہم کیا خدمت کرسکتے ہیں۔“ محمود بولا۔

” انسپکٹر جمشید صاحب سے ملا دیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

” آپ مسکرا کیوں رہے ہیں؟“ فاروق کو اس کی ہنسی نہ جانے کیوں زہریلی لگ رہی تھی۔

” اس لیے کہ مسکرانا میری عادت ہے۔ میں ہر حالت میں مسکرانے کا عادی ہوں۔ ہر وقت مسکراتا رہتا ہوں۔ یہاں تک کہ سوتے وقت بھی۔“ وہ کہتا چلا گیا۔

” آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ سوتے میں بھی مسکراتے رہتے

ہیں؟“ فاروق کے لہجے میں حیرت در آئی۔

” میری ماں نے یہ بات مجھے بتائی تھی کہ میں سوتے میں بھی مسکراتا ہوں اور میری ماں نے کبھی مجھ سے کوئی غلط بات نہیں کہی۔“ اس نے جواب دیا۔

” خیر تو سنیے، ہمارے ابا جان ابھی گھر نہیں لوٹے۔ اگر آپ انتظار کرنا چاہتے ہیں تو ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے۔“

” ہاں ضرور، انتظار تو مجھے کرنا ہی ہوگا۔“ اس نے کہا۔

” کیا آپ کو ان سے کوئی خاص کام ہے۔“

” ہاں، بہت ہی خاص۔“ اس نے پھر مسکرا کر کہا۔

” اوہو، ذرا ہم بھی تو سنیں، وہ کتنا خاص کام ہے۔“ محمود نے حیران ہو کر کہا۔

” آپ کیا کریں گے پوچھ کر۔ یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے۔“ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ محمود نے اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا تھا۔

” ان کا ہر معاملہ ہمارا معاملہ بھی ہے۔“ فرزانہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

” خیر میں بتلائے دیتا ہوں۔ مجھے ان سے ایک پنکچر لگوائی لینی ہے۔“ نوجوان نے عجیب بات کہی۔

” پنکچر لگوائی، کیا مطلب؟ کیا ان کی جیپ پنکچر ہوگئی تھی

اور انہوں نے آپ سے پنکچر لگوایا تھا، لیکن نہیں، بھلا یہ بات کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ تو ایسا کام کبھی کرتے ہی نہیں۔ ان کے پاس بھلا اتنا وقت کہاں — اگر کبھی اتفاق سے کار یا جیپ پنکچر ہو جاتی ہے تو اسے وہیں چھوڑ کر ٹیکسی میں بیٹھ کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں — کار یا جیپ بعد میں مرمت ہوتی رہتی ہے، لہٰذا آپ غلط کہہ رہے ہیں — انہوں نے آپ سے پنکچر ہرگز ہرگز نہیں لگوایا ہوگا۔" فرزانہ کہتی چلی گئی —

"تو میں نے کب کہا ہے کہ انہوں نے مجھ سے پنکچر لگوایا تھا — کیا میں آپ کو کوئی موٹر مکینک نظر آ رہا ہوں۔" اس نے کہا —

"نظر تو خیر نہیں آتے، لیکن ہو ضرور سکتے ہیں۔" فاروق مسکرایا —

"خیر خیر، میں موٹر مکینک ہو سکتا ہوں یا نہیں، مجھے ان سے پنکچر لگوائی ضرور وصول کرنی ہے — انہوں نے دراصل میری کار کا ایک ٹائر پنکچر کر دیا ہے — میں بھی اپنی کار وہیں چھوڑ کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر یہاں پہنچا ہوں؛ گویا مجھے ان سے ایک پنکچر اور دو طرفہ ٹیکسی کا کرایہ وصول کرنا ہے۔"

"انہوں نے ٹائر پنکچر کر دیا ہے؟" تینوں کے منہ سے حیرت

زدہ انداز میں نکلا —

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی —

نرغے میں

انسپکٹر جمشید نے سفید کار کو لنگڑاتے دیکھا تو بے ساختہ مسکرا دیے۔ نوجوان اپنی شوخی میں مگن تھا اور اس دوران انہوں نے اپنا کام دکھا دیا۔ جیب میں اس قسم کی بہت سی ننھی منی چیزیں ہمیشہ موجود رہا کرتی تھیں، جن سے وہ ایسے مواقع پر کام لیا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک نوک دار اوزار سے کام لے کر نوجوان کی کار کے اگلے ٹائر میں نہایت باریک سا سوراخ کر دیا تھا — اتنا باریک کہ ہوا نکلنے کی آواز بھی سنائی نہ دے سکی اور کچھ دور چلنے کے بعد ٹائر بے کار ہوا، کار کے نمبر انہوں نے نوٹ کر ہی لیے تھے، لہذا ایک دم کار کی رفتار بڑھا دی، پھر اچانک انہیں ایک خیال سوجھا۔ ایک پبلک فون بوتھ پر جیپ روک کر وہ نیچے اترے اور دفتر میں ڈیوٹی آفیسر کو فون کیا، کیونکہ اکرام تو پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ وہ سرکوٹھی والا کی کوٹھی کی نگرانی خود کرے گا — فوراً ہی ڈیوٹی آفیسر کی آواز سنائی دی:

"میں انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔"

"اوہو، میں تو آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔" ڈیوٹی آفیسر نے چونک کر کہا۔

"کیوں خیر تو ہے۔"

"ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ امجد اے کریم صاحب نے خودکشی کر لی ہے۔ ان کی میز پر ایک کاغذ پایا گیا۔ اس کاغذ پر آپ کا نام لکھا ہے۔"

"میرا نام۔" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔"

"اچھی بات ہے، میں دیکھتا ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ سرور گنج روڈ پر ایک آدمی کو جیپ دے کر بھیج دیں۔ اس سڑک پر ایک سفید کار پانچویں میل کے قریب پنکچر حالت میں نظر آئے گی۔ اگر اس کار میں کوئی نوجوان ہو تو اس کا تعاقب کرنا ہے، ورنہ اس کار کی نگرانی کرنی ہے۔ جب بھی نوجوان وہاں آئے، اس کی نگرانی شروع کر دی جائے۔" یہ کہہ کر انہوں نے نوجوان کا حلیہ اور کار کے نمبر نوٹ کرا دیے۔

"بہت بہتر سر، میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں۔"

"اور ہاں، اگر گھر سے فون آئے تو انہیں بتا دیں کہ میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔"

"جی بہتر" اس نے کہا اور وہ ریسیور رکھ کر باہر نکل آئے۔
جیپ میں بیٹھتے ہی انہیں ایک عجیب سا احساس ہوا — انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر دیکھا — فوراً ہی ان کے کانوں سے یہ الفاظ ٹکرائے :

"ذرا دیر سے چونکے انسپکٹر — اب جو یہ چیز تمہاری گدی میں چبھ رہی ہے، سوائے پستول کے اور کچھ نہیں ہے، لہٰذا جیپ کو پہلے بالکل سیدھا اور پھر دائیں طرف موڑ دو۔ میرا مطلب مشرقی سڑک پر موڑنے سے ہے"

آواز بہت بھرائی ہوئی تھی — وہ جو کوئی بھی تھا سیٹ کے پیچھے چھپا ہوا تھا — نالی کی ٹھنڈک انسپکٹر جمشید نے اپنی گدی پر محسوس کی —

"اچھا دوست، تم بھی کیا یاد کرو گے" یہ کہہ کر انہوں نے جیپ چلا دی -

"تم چاہتے کیا ہو ؟"

"بہت پرانا حساب چکانا ہے تم سے" آواز آئی -

"کتنا پرانا — سو دو سو سال پرانا" وہ بولے -

"ساری شوخی اور طراری بھول جاؤ گے انسپکٹر" غرائی ہوئی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی -

"کیا واقعی ؟" وہ چہکے -

"بہت جلد معلوم ہو جائے گا"

چوراہے سے جیپ مشرقی سڑک پر مڑ گئی — انسپکٹر جمشید کے سکون میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا —

"کیا خیال ہے، رفتار کم محسوس ہو رہی ہو تو بڑھا دوں" وہ کچھ سوچ کر بولے -

"نہیں، مجھے اتنی جلدی نہیں ہے — میں جانتا ہوں — تم رفتار بڑھا کر یک دم بریک لگا کر مجھے ادھر ادھر لڑھکا دینے کا پروگرام سوچے ہوئے ہو، لیکن تمہارا یہ خواب پورا نہیں ہو گا، کیوں کہ میں تم سے بہت اچھی طرح واقف ہوں"

"معلوم ہوتا ہے، بہت لمبا چوڑا منصوبہ بنا کر آئے ہو"

"ہاں، اس دن کا مجھے بہت دنوں سے انتظار تھا"

"چلو شکر ہے، دن آ گیا" انسپکٹر جمشید بولے -

جیپ شہر سے باہر نکل کر گھنے جنگل میں سے گزرنے لگی - تقریباً دس منٹ اور چلنے کے بعد اس نے کہا :

"دائیں طرف موڑ لو"

"بہت اچھا" انہوں نے کہا اور جیپ موڑ لی — یہ دیکھ کر وہ حیران ہوئے کہ اس طرف بھی ایک تنگ سڑک موجود تھی۔ اس کے دونوں طرف فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ اب سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا — آس پاس انہیں

کوئی بھی نظر نہیں آیا— اور پھر جیپ ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے رک گئی—

"چلو اترو نیچے، خبردار کوئی حرکت نہ کرنا، ورنہ گدی میں سوراخ ہو جائے گا۔"

"بہت اچھا، نہیں کروں گا کوئی حرکت۔" وہ بولے اور نیچے اتر آئے— وہ چاہتے تو کبھی کا اس پر ہاتھ ڈال چکے ہوتے، لیکن وہ دیکھنا یہ چاہتے تھے کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"جیپ سے پانچ قدم آگے بڑھ جاؤ، گن کر قدم اٹھانا۔" ان کے اترنے کے بعد کہا گیا۔

انہوں نے ہدایت پر عمل کیا، پھر پستول والا بھی نیچے اتر آیا اور بولا:

"ٹھیک ہے، اب دروازے کی طرف بڑھو۔"

وہ چلنے لگے— دروازہ کھلا ملا۔

"اندر داخل ہو جاؤ۔"

وہ اندر داخل ہوئے— ان کے پیچھے انہوں نے اس کے قدموں کی آواز بھی سنی— آخر وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے— سامنے والی دیوار کے ساتھ انہیں ایک اور شخص کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا اور نالی کا رخ ان کی طرف۔ جونہی وہ کمرے کے درمیان میں پہنچے، ایک دوسری آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"بہت خوب، آج یہ ہمارے ہتھے چڑھ ہی گئے— بھئی واہ، مزا آگیا۔"

وہ مڑے— انہوں نے دیکھا، ان کے پیچھے بھی ایک پستول والا کھڑا تھا— دائیں اور بائیں طرف بھی دو آدمی بھی موجود تھے— گویا اس شخص کے علاوہ جو انہیں یہاں تک لایا تھا، چار آدمی اور تھے اور ان چاروں کے ہاتھوں میں پستول تھے—

"ہاں، اب اسے سنبھالنا تمہارا کام ہے۔" اس کی آواز آئی جو انہیں یہاں لایا تھا۔ اس وقت تک وہ کسی کا چہرہ صاف طور پر نہیں دیکھ سکے تھے۔ انہوں نے اپنے کوٹوں کے کالر اوپر اٹھا رکھے تھے اور ہیٹ چہروں پر جھکا رکھے تھے— کمرے میں جو بلب روشن تھا، وہ بھی تیز روشنی والا نہیں تھا۔ آنکھوں پر وہ چشمے لگائے ہوئے تھے—

"تم کون ہو دوستو اور کیا چاہتے ہو؟"

"انتقام لیں گے تم سے— بہت پرانا انتقام— ہمارے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔"

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتے ہو۔" انہوں نے حیران ہو کر کہا—

"یہ دیکھو، میں اپنا چہرہ تمہیں دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر ان کے سامنے والے نے کوٹ کے کالر گرا دیے— ہیٹ اوپر اٹھا دیا اور

آنکھوں پر سے چشمہ بھی اتار لیا — وہ اس کا چہرہ دیکھ کر چونک اٹھے۔

"میرا چہرہ بھی دیکھ لو۔" دوسرے نے کہا اور اسی طرح پانچوں نے اپنے چہرے نمایاں کر دیے۔ وہ ہر بار چونکتے رہے اور اب ان کی سمجھ میں یہ بات آچکی تھی کہ وہ کن لوگوں کے نرغے میں ہیں۔ یہ پانچوں قاتل تھے — ایک کیس میں انہوں نے انہیں گرفتار کرایا تھا اور انہیں بیس بیس سال کی سزا ہوئی تھی، لیکن چند سال بعد ہی یہ پانچوں جیل سے بھاگ نکلے تھے اور پولیس انہیں دوبارہ گرفتار نہیں کر سکی تھی — آج وہ ان کے چاروں طرف کھڑے تھے۔

"تم مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتے ہو — کیا تم نے قتل نہیں کیا تھا اور میں نے تمہیں بے گناہ پھانسا تھا؟"

"نہیں، ہم قاتل تھے، لیکن اگر تم ہمارے راستے میں نہ آ جاتے تو ہم کبھی جیل نہ جاتے — ہم جیل میں گزارے ہوئے چند سالوں کا تم سے انتقام لیں گے۔"

"اچھا بھائی، لے لو انتقام۔" انہوں نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"چلو گنگو تیلی، اپنے پستول کو نالی کی طرف سے پکڑ کر استعمال میں لاؤ — اس طرح کہ انسپکٹر جمشید کے منہ، ناک اور سر سے خون نکلتا دکھائی دے — جیتا جیتا، سرخ سرخ خون۔"

"کیوں نہیں، یہ خوش گوار فرض انجام دینے کے لیے تو میں

کب سے بے تاب ہوں۔" گنگو تیلی نے خوش ہو کر کہا۔

"ہم چاروں اپنے اپنے پستول تانے رہیں گے۔ اگر اس نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہم اسے مزا چکھا دیں گے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ اس کے لیے میں ہی کافی ہوں گا۔" گنگو تیلی نے کہا اور پستول کو نالی کی طرف سے پکڑ کر وحشیانہ انداز میں آگے بڑھا — اس کی آنکھوں میں درندگی تھی۔

"ٹھہرو بھئی، پہلے ایک بات بتا دو۔" انسپکٹر جمشید ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"کیوں ڈر گئے، موت کو سامنے دیکھ کر۔"

"نہیں، ابھی مجھے موت کہاں دکھائی دی ہے — وہ نوجوان بھی کیا تمہارا ساتھی تھا۔"

"کون سا نوجوان؟"

"سفید کار میں جو میرا تعاقب کر رہا تھا۔" وہ بولے۔

"ہم کسی سفید کار والے نوجوان کو نہیں جانتے۔" پہلے نے کہا۔

"تب پھر تم میری جیپ میں کیسے سوار ہو گئے تھے؟"

"میں دفتر سے ہی تمہارے تعاقب میں تھا۔" اس نے کہا۔

"تب تو تم جھوٹے بھی ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"وہ کیسے؟" اس نے بھنا کر کہا۔

"ایسے کہ میں نے راستے میں جیپ روکی تھی اور اتر کر اس سفید

کار کی طرف گیا تھا۔ میں نے اس سے چند باتیں بھی کی تھیں اور پھر
واپس اپنی جیپ میں آ گیا تھا۔ اگر تم شروع سے میرے تعاقب
میں تھے تو تم اس سفید کار والے سے کس طرح بے خبر رہے، جبکہ میں
یہ سمجھتا ہوں کہ وہ نوجوان بھی میرا تعاقب کر رہا تھا۔"

"لیکن میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں نے سڑک پر سفید کار
کو تمہارے پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ ہم کسی سفید
کار والے کو نہیں جانتے۔" اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوہ ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔ خیر، تو تم نے اس سفید کار
والے کو دیکھا تو تھا۔" انسپکٹر جمشید ان سے اس طرح باتیں کر رہے
تھے، جیسے آپس میں دوست ہوں۔

"ہاں، میں سفید کار کے پیچھے تھا۔ میں نے شروع سے ہی یہ
محسوس کر لیا تھا کہ سفید کار والا بھی تمہارے تعاقب میں ہے اور شاید
اسی لیے تم مجھ سے بے خبر رہے۔"

"ہوں، بالکل یہی بات ہے۔ اب تم اپنے گنگو تیلی سے کہو کہ
مجھ پر وار کرے۔"

گنگو ان کے الفاظ سنتے ہی آگے بڑھا اور اندھا دھند انداز
میں پستول کا دستہ ان کے سر پر دے مارا، لیکن اس کا ہاتھ ہوا میں
جھول کر رہ گیا۔ انسپکٹر جمشید تو اس سے چند قدم کے فاصلے پر
کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"تمہارا پہلا وار خالی گیا مسٹر تیلی، بہتر ہوگا کہ تیل ہی بیچا کرو۔"
انہوں نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ گنگو تیلی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
اس نے دیوانہ وار ان پر چھلانگ لگائی اور دھپ سے زمین پر آ رہا۔
انہوں نے نہایت صفائی سے جھکائی دی تھی۔

"دیکھو بھئی، میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں۔ مطلب یہ کہ میری
طرف سے ابھی تک جوابی حملہ نہیں ہوا، اس لیے کہیں چوڑے نہ
ہو جانا۔"

گنگو تیلی پھر اٹھا۔ اس کا چہرہ اب بہت خوف ناک لگ رہا
تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پستول کو دستے کی طرف سے پکڑا
اور نالی کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلنے
کا دھماکا ہوا، گولی دیوار میں دھنس گئی۔

"بھئی یہ کیا، تم تو میری مرمت کرنے چلے تھے۔ اس طرح تو
میں مرمت کے قابل نہیں رہ جاؤں گا۔" انسپکٹر جمشید ہنسے۔ اس مرتبہ
انہوں نے لوٹ لگائی تھی۔

"یوں کام نہیں بنے گا۔ تم چاروں اپنے اپنے پستول لے کر
اس پر پل پڑو۔" انہیں لانے والے نے کہا۔

"تو تم الگ رہ کر کیا کرو گے۔ تم بھی ان کے ساتھ ہی ٹوٹ
پڑو نا۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں، میں دروازے پر موجود رہوں گا، تاکہ تم فرار نہ ہو

سکو۔" اس نے کہا۔

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ میرے ہاتھوں پٹنے سے بچنا چاہتے ہو۔"

وہ بولے: "مار کھانے کے لیے یہی بے چارے رہ گئے ہیں۔"

"ہوشیار، یہ ہمیں آپس میں لڑا کر خود کو بچانا چاہتا ہے۔"

گویا اس نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا۔

"لیکن یہ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا تارے۔ آخر تم دروازے میں کھڑے رہ کر کیا کروگے۔ آؤ اور ہمارا ساتھ دو۔" گنگو نے بلند آواز میں کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن میرے ہٹنے سے دروازہ غیر محفوظ ہو جائے گا اور یہ فرار ہو سکتا ہے۔" تارا بولا۔

"اس کی آسان اور سادہ ترکیب میں بتا دیتا ہوں۔ دروازہ اندر سے بند کر لو، چٹخنی لگا لو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور کیا۔" گنگو تیلی نے جھٹ کہا۔

"اچھا گنگو، تم بھی اس کی باتوں میں آ گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص کو جتنا میں جانتا ہوں، تم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ کیا تم یہ بھی بھول گئے کہ اسے میں اکیلا یہاں لایا ہوں۔ خیر، یہ لو، میں دروازہ بند کیے دیتا ہوں اور اب بے شک تم چاروں ہی پیچھے ہٹ جاؤ، میں اکیلا اس سے ٹکراؤں گا۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔" چاروں

نے ایک ساتھ کہا۔

دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی گئی۔ اب وہ پانچوں پستولوں کے دستوں سے ان پر حملہ آور ہوئے۔ ایک ساتھ پانچ دستے ان کے سر کی طرف بڑھے۔ وہ یک دم نیچے بیٹھے اور ان کے درمیان سے نکل گئے، لیکن اسی وقت تارے نے جھک کر ان کے سر پر دوسرا وار کیا۔ وہ ترچھے ہو گئے اور دستہ ان کے کندھے کی ہڈی پر لگا۔ وار شدید تھا۔ اگر سر پر لگ جاتا تو اس وقت تک وہ اپنے ہوش میں نہ رہتے؛ تاہم ہڈی کی تکلیف نے انہیں پریشان کر دیا۔ وہ بلا کی رفتار سے مڑے اور تارے کے منہ پر ایک زوردار مکا دے مارا۔

بس پھر کیا تھا، ان کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ادھر انہوں نے ان پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ اس ہنگامے میں پستول کے کئی دستے ان کے جسم پر لگ گئے، لیکن وہ ہر بار اپنا سر منہ بچا جاتے۔ ادھر دشمنوں کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح سر یا منہ پر وار کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

ابھی یہ جنگ پوری شدت سے جاری تھی کہ ایک فائر ہوا۔ انسپکٹر جمشید دھڑام سے گرے۔ ساتھ ہی ایک آواز کمرے کے باہر سے اندر آئی:

"بے وقوفو، تم اس طرح تو قیامت تک اس پر قابو نہیں پا سکو گے۔ لو اب اسے سنبھال لو۔"

دروازہ ٹوٹتا ہے

محمود نے فون کا ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے پھر گیلانی رضا کی آواز سنائی دی:

"ہیلو، کیا انسپکٹر جمشید ابھی تک گھر نہیں پہنچے؟"

"جی نہیں۔ خدا جانے کیا بات ہے۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"تو پھر دفتر فون کر کے معلوم کریں، شاید وہ کچھ بتا کر گئے ہوں۔"

"بہت بہتر، ہم ابھی فون کرتے ہیں۔ آپ دو منٹ بعد پھر فون کیجیے گا۔" محمود نے کہا اور سلسلہ کاٹ کر دفتر کے نمبر ملائے۔ فوراً ہی ڈیوٹی آفیسر کی آواز سنائی دی۔ محمود نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"ابا جان کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟"

"ابھی ابھی ان کا فون آیا تھا۔ میں نے انہیں امجد اے کریم

کی خودکشی کے بارے میں بتایا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر آپ لوگوں کا فون آئے تو بتا دوں کہ وہ کچھ دیر بعد گھر آئیں گے۔"

"لیکن انہوں نے آپ کو فون کیوں کیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ امجد لے کریم کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"اوہ ہاں، یاد آیا۔ انہوں نے سفید کار والے ایک نوجوان کی نگرانی کا حکم دیا تھا۔ سرور گنج روڈ پر اس کی کار کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ میں اس کی نگرانی کے لیے آدمی بھیج چکا ہوں۔"

"اوہ۔" محمود کے منہ سے نکلا۔ پھر اس نے کہا:

"اچھی بات ہے، اگر ابا جان کا فون آئے تو انہیں بتا دیں کہ ہم گھر میں پریشان بیٹھے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور سلسلہ بند کر دیا۔ محمود ریسیور رکھ کر نوجوان کی طرف مڑا:

"ابا جان کا تو کوئی پتا نہیں چل رہا جناب، ضرور وہ کہیں اور چلے گئے ہیں۔ ویسے انہوں نے آپ کی کار کا ٹائر کون سی سڑک پر پنکچر کیا تھا؟"

"سرور گنج روڈ پر۔" نوجوان نے کہا۔

"اور آپ کی کار ابھی تک وہیں ہے؟"

"پتا نہیں، وہاں ہے یا نہیں۔ میں تو اس سے اتر کر سیدھا یہاں آ گیا تھا، تاکہ ہرجانہ وصول کر سکوں۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ

وہ سیدھے گھر نہیں آئیں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ انہوں نے ٹائر پنکچر کیوں کیا؟"

"وہ اس خیال میں مبتلا ہو گئے تھے کہ میں ان کا تعاقب کر رہا ہوں؛ حالانکہ میں اس سفید کار کو خریدنے کے چکر میں ہوں اور اسے چلا کر دیکھ رہا تھا۔"

"کمال ہے، اتنی سی بات پر تو وہ ٹائر پنکچر نہیں کر سکتے تھے۔" فرزانہ بولی۔

"اب یہ تو وہی بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے کتنی سی بات پر یہ کام کیا ہے۔ آپ صبح سویرے آ کر ہرجانہ وصول نہیں کر سکتے؟" محمود بولا۔

"کیوں، آپ کہیں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں، بات تو ایسی ہی ہے۔"

"تو آپ چلے جائیں، میں ان کا انتظار کر لوں گا۔"

"لیکن جناب، گھر میں ہمارے جانے کے بعد صرف ہماری امی رہ جائیں گی۔ ہم آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، پھر آپ کو گھر میں کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بہت اچھا، تو پھر میں چلا جاتا ہوں، لیکن میں ہرجانہ ضرور وصول کروں گا۔ اگر انہوں نے ہرجانہ ادا نہ کیا تو میں عدالت میں مقدمہ دائر کر دوں گا اور یہ اپنی نوعیت کا عجیب ترین مقدمہ ہو گا۔"

انہوں نے اپنی امی کو ساری بات سمجھائی اور ان کی اجازت ملنے کے بعد دروازے کی طرف قدم اٹھا دیے۔ عین اسی وقت فون کی گھنٹی پھر بجی۔ تینوں ٹھٹک کر رک گئے۔ محمود نے ریسیور اٹھایا، تو دوسری طرف سے ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی:

"ہیلو، میں سر کوٹلی والا بول رہا ہوں۔ یہ انسپکٹر جمشید کا ہی گھر ہے نا؟"

"جی بالکل، انہی کا ہے۔"

"مہربانی فرما کر ریسیور انہیں دیں، میرا نام انہیں بتا دیں۔"

"افسوس، میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟" ادھر سے حیران ہو کر کہا گیا۔

"ابا جان گھر میں نہیں ہیں، وہ دفتر میں بھی نہیں ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔"

"اوہ، اب کیا ہوگا؟" دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جی کیا مطلب؟ خیر تو ہے۔" محمود نے بھی پریشان ہو کر کہا۔

"میں آج دوپہر دفتر میں ان سے ملاقات کر چکا ہوں۔ انہوں نے شام کے وقت میرے ہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ان کے آنے میں دیر ہوئی تو میں نے فون کر دیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ میری خودکشی کرنے کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے۔ میری یہ حالت دفتر سے

اس نے تیز آواز میں کہا۔

"دیکھیے جناب، ہمیں ڈرانے کی کوشش نہ کریں۔ ہم پہلے ہی ڈر ڈر کر بہت دبلے پتلے ہو چکے ہیں۔" فاروق نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

محمود اور فرزانہ مسکرانے لگے۔ آخر نوجوان اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے رخصت کر کے انہوں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ اب محمود نے انہیں ڈیوٹی آفیسر سے فون پر ہونے والی گفت گو سنائی۔

"اوہ، تو یہ نوجوان غلط نہیں کہہ رہا تھا۔"

"نہیں، لیکن اگر ابا جان نے اس کی کار کا ٹائر پنکچر کیا ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ بھی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں۔ ابا جان نے اجدالے کریم کی خودکشی کے متعلق سُن کر ہی اپنا رخ گھر کی بجائے اس طرف کیا ہوگا، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ وہ وہاں بھی نہیں پہنچے۔"

"تو کیوں نہ ہم تینوں اجدالے کریم کی لاش کا جائزہ لے آئیں۔" فرزانہ بولی۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" محمود بولا۔

"اگر تم دونوں یہی چاہتے ہو تو پھر میرے چاہنے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔ چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

آنے کے بعد ہی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے میں کچھ دیر تک خودکشی کر لوں گا۔"

"یہ — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"مم، میں — میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا — میرے ہاتھ — میرے ہاتھ خود بخود گلے کی طرف بڑھ جاتے ہیں اور میں زبردستی انہیں نیچے لاتا ہوں، لیکن یہ پھر اوپر اٹھنے لگتے ہیں — خدا کے لیے میری مدد کرو — نہیں تو..... نہیں تو....."

محمود نے ریسیور گرنے کی آواز سنی — اس کے اوسان خطا ہو گئے — اس کے چہرے پر شدید گھبراہٹ دیکھ کر فرزانہ نے پوچھا:

"خدا خیر کرے، تم نے کوئی بری خبر تو نہیں سنی۔"

"نہیں سب سے پہلے سر کوٹلی والا کی کوٹھی پہنچنا چاہیے۔" محمود نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا —

"سر کوٹلی والا، کیا مطلب؟" فرزانہ چونکی۔

"اب میں نام کا مطلب کیا بتاؤں؟" محمود جھلا کر بولا۔

"معلوم بھی ہے، سر کوٹلی والا کون ہے؟" فرزانہ تیزی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں، جانتا ہوں — ہمارے ملک کی ایک مشہور شخصیت ہیں، بلکہ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ماڈل سٹی میں رہتے ہیں۔" محمود بولا —

"انہیں کیا ہوا ہے؟" فاروق نے تنگ آ کر پوچھا۔

"وہ — ان کا جی خودکشی کرنے کو چاہ رہا ہے۔"

"خودکشی کرنے کو جی چاہ رہا ہے — اور — اور — امجدلے کریم نے بھی خودکشی کر لی ہے — اُف خدا، یہ سب کیا ہے۔" فرزانہ نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

اور پھر تینوں دروازے کی طرف دوڑ پڑے — بیگم جمشید نے جو ان کے دوڑنے کی آواز سنی تو وہ بھی دوڑی آئیں —

"خیر تو ہے، تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

"سر کوٹلی والا کے ہاں — وہ خودکشی کرنے والے ہیں۔ اگر ابا جان یہاں پہنچ جائیں تو انہیں بتا دیجیے گا۔ ان کا ابھی ابھی فون آیا تھا۔" محمود نے دوڑتے ہوئے کہا، پھر وہ باہر نکل کر اپنی موٹر سائیکلوں پر بیٹھ گئے — دوسرے ہی لمحے موٹر سائیکلیں اڑی جا رہی تھیں — فرزانہ محمود کے ساتھ تھی —

"امجدلے کریم کا کیا کریں؟" فرزانہ بولی۔

"وہ تو اب خودکشی کر چکے ہیں، بعد میں بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے، لیکن ادھر ایک زندگی خطرے میں ہے — میں حیران ہوں، سر کوٹلی والا کے گھر والوں کو کیا ہوا — کیا وہ بھی ان کی مدد نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو وہیں چل کر پتا چلے گا۔"

اور جب انہوں نے موٹر سائیکل کوٹھی کے احاطے میں روکے تو کسی طرف سے اکرام بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔ آتے ہی اس کے منہ سے نکلا:

"ارے، یہ آوازیں کیسی ہیں؟"

اندر سے بے تحاشا دروازہ پیٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔

وہ بے دھڑک اندر گھس گئے اور اس سمت میں بڑھتے چلے گئے، جس طرف سے دروازہ پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا، ایک دروازے کو دو لڑکے، ایک لڑکی اور ایک عورت زور زور سے پیٹ رہے تھے۔

"یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" محمود نے بلند آواز میں کہا۔

وہ ایک ساتھ پلٹے۔ حیرت بھرے انداز میں ان تینوں کو دیکھا، پھر لڑکی نے چیختی آواز میں کہا:

"اندر ہمارے ابو۔۔۔ ہم نے میزیں اور کرسیاں گرنے کی آوازیں سُنی ہیں۔"

"تو سر کوٹھی والا اس کمرے میں ہیں؟"

"ہاں۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اچھا تو آپ لوگ دروازے پرے ہٹ جائیے، ہم اسے توڑے ڈالتے ہیں۔"

وہ ہٹ گئے۔ چاروں نے مل کر دروازوں پر کندھوں سے ٹکریں مارنا شروع کیں۔ آخر چند منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ اندر کا منظر حد درجے دہشت ناک تھا۔ گھر کے افراد کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔

○

وہ انسپکٹر جمشید کو گرتے دیکھ کر حیران رہ گئے، پھر انہوں نے بوکھلا کر اس کھڑکی کی طرف دیکھا، جس کے ایک سوراخ میں سے فائر کیا گیا تھا اور اب اس میں سے آواز آئی تھی۔

"اوہو باس، آپ ہیں۔"

"ہاں، میں جانتا تھا، تم اس پر قابو نہیں پاسکو گے۔ بہادری سے اس شخص پر قابو پانا بہت ہی مشکل ہے۔ اس پر تو دھوکے سے ہی قابو پایا جاسکتا ہے۔ میں نے صرف اس کی ران پر گولی ماری ہے۔ تم بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال سکو گے۔ چلو شروع ہو جاؤ، میں بھی یہ دل خوش کن منظر دیکھنا پسند کروں گا۔"

پانچوں کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ چاروں طرف سے ان کے گرے ہوئے جسم کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے تارے نے ان کے سر پر ایک ٹھوکر رسید کی، فوراً بعد ہی گنگو نے پستول کا دستہ ان کے

سر پر رسید کیا — ان کے سر سے خون نکلتا نظر آیا' اور پھر تو انہوں نے پستولوں کے دستے تابڑ توڑ مارنے شروع کر دیے — غرض جسم کا کوئی حصہ نہ چھوڑا — زیادہ وار پسلیوں' گھٹنوں' ٹخنوں اور سر پر کیے' پھر اچانک ان کے باس کی آواز سنائی دی:

"اب بس کرو، جان سے ہی نہ مار ڈالنا' ورنہ یہ تم سے بدلہ لینے کی آگ میں کس طرح جھلس سکے گا — کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ یہ ساری عمر تم سے انتقام ہی لینے کے لیے تڑپتا رہے۔"

"ہاں باس، تم ٹھیک کہتے ہو۔" تارے نے کہا۔

"تو آؤ چلیں، مگر نہیں — اسے اٹھا کر سڑک کے کنارے ڈال دو، تاکہ کوئی اسے اٹھا کر ہسپتال تک پہنچا دے — یہاں پڑا پڑا تو مر ہی جائے گا۔"

"اوکے باس۔"

انہوں نے مل کر انسپکٹر جمشید کو اٹھایا۔ عمارت سے باہر لائے اور پھر جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر سڑک کے کنارے تک لے گئے۔ اب انہوں نے جیپ روکی اور انہیں باہر نکالا اور سڑک کے کنارے ڈال دیا، پھر خود جیپ میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک رات کی تاریکی پھیل چکی تھی — آخر وہ سڑک پر اس جگہ پہنچ گئے، جس جگہ سے انسپکٹر جمشید نے جیپ سے اتر کر فون کیا تھا اور تارا جیپ میں داخل ہوا تھا۔ انہوں نے جیپ کو سڑک کے

کنارے چھوڑا اور کچھ دور کھڑی اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ اس وقت انہیں اپنے باس کا خیال آیا۔

"ارے' حیرت ہے۔ ہم نے عمارت سے باہر نکلنے پر باس کو تو دیکھا ہی نہیں۔" تارے کے منہ سے نکلا۔

"باس بھلا وہاں کیوں ٹھہرتے — اس سے پہلے وہ کب ہمارے سامنے آتے تھے' جو آج آتے — ہم نے ان کی صرف آواز سنی ہے' شکل آج تک نہیں دیکھی۔"

"مجھے تو حیرت یہ ہے کہ اس نے ہمیں جیل سے کس طرح رہا کرا دیا۔"

"چھوڑو' ایسی باتیں سوچنے کی ہمیں ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم اب آزاد ہیں اور اس کے کام کرنے کی صورت میں بالکل محفوظ — اس نے اس روز کہہ دیا تھا' جس روز ہم جیل سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے تھے' کہ ہم جیل سے اس کی مدد سے نکلے ہیں اور اب اسی صورت میں باہر رہ سکتے ہیں' جب اس کے لیے کام کرتے رہیں'

"ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ اسے انسپکٹر جمشید سے کیا دشمنی ہے۔ ہم تو خیر اس کے دشمن ہیں ہی۔"

"کوئی دشمنی تو ہو گی ہی، ورنہ یوں ہی تو کوئی کسی کے پیچھے نہیں پڑ جاتا۔"

"خیر انسپکٹر جمشید بھی کیا یاد کرے گا۔ ایسی مار اس نے کم ہی

کھائی ہوگی۔"

ان کی کار تیز رفتاری سے ایک سمت میں جا رہی تھی۔ پھر وہ ایک عمارت میں داخل ہوئے۔ فوراً ہی یہ الفاظ ان کے کانوں سے ٹکرائے:

"اب تم کچھ عرصہ تک اس عمارت کے خفیہ تہہ خانے میں رہوگے۔"

سرخ نشان

سر کوٹلی والا فرش پر بچھے قالین پر گرے پڑے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھ اپنے گلے پر تھے۔ دونوں ہاتھ گلے پر اس سختی سے جمے ہوتے تھے کہ اُن کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ آنکھیں باہر کو اُبلی ہوئی تھیں اور منہ سے پانی بہہ کر سینے کے قریب قمیص کو گیلا کر چکا تھا۔

گھر کے افراد بے تابانہ ان کی لاش سے لپٹ گئے۔ محمود نے ان کی نبض دیکھی، وہ دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ فون کا ریسیور میز سے نیچے لٹک رہا تھا۔ یہ ان کی زندگی کا حیرت انگیز ترین واقعہ تھا۔ انھوں نے کسی آدمی کو آج تک اس طرح مرتے نہیں دیکھا تھا۔ بھلا کوئی اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا بھی گھونٹ سکتا ہے۔ یہ تقریباً ناممکن تھا، لیکن اس وقت یہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

اکرام نے ریسیور اٹھا کر دفتر کے نمبر ڈائل کیے اور ڈیوٹی آفیسر

کو اس حادثے کی اطلاع دی ۔ اس دوران محمود، فاروق اور فرزانہ
بغور لاش کا جائزہ لیتے رہے ۔ فرزانہ کو ہنسلی کی ہڈی پر ایک سرخ
سا دھبا نظر آیا ۔

"اس دھبے کو دیکھ رہے ہو ۔"

"ہاں ایسا لگتا ہے، جیسے خون کا چھینٹا لگ گیا ہو، لیکن
یہاں خون کہاں ۔ سرکوٹلی والا صاحب نے تو اپنے دونوں ہاتھوں
سے خودکشی کی ہے ۔" فاروق بولا ۔

"خون تو خیر جلد پر ہے ہی نہیں ۔" فرزانہ بولی ۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو ؟" فاروق نے کہا اور پھر سرکوٹلی والا
کی ہنسلی کی ہڈی پر انگلی پھیر کر دیکھا ، وہ نشان بدستور موجود رہا ۔
فاروق کی انگلی پر خون کا دھبا بھی نہ لگا ۔

"تمہارا ہی خیال ٹھیک ہے، یہ نشان شاید پیدائشی ہے ۔"

"شاید یہی بات ہے ۔"

"کیا بات ہے ؟" اکرام فون کا ریسیور رکھتے ہوئے بولا ۔

"لاش کی ہنسلی کی ہڈی پر ایک پیدائشی نشان ہے ۔ بالکل خون
کے ایک چھینٹے کی مانند ۔"

ان کی باتوں نے گھر کے افراد کو چونکا دیا ۔ انہوں نے بھی
اس نشان کو دیکھا اور پھر عورت بولی :

"لیکن یہ نشان پیدائشی ہرگز نہیں ہے ۔"

"اوہ اچھا ۔" ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا ۔

"بالکل، آپ ان بچوں سے پوچھ لیں ۔"

تینوں بچوں نے بھی عورت کی بات کی تصدیق کی ۔

"تو آپ سرکوٹلی والا کی بیوہ ہیں اور یہ ان کے بچے ۔" محمود
بولا ۔

"ہاں ۔" اس نے روتے ہوئے کہا ۔

تھوڑی دیر بعد دفتر کا عملہ وہاں پہنچ گیا اور اس وقت انہیں
خیال آیا کہ انہیں ابھی اجداے کریم کے ہاں بھی جانا ہے ۔
اب یہاں ان کے لیے کوئی کام بھی نہیں رہ گیا تھا ۔ وہ
تو سرکوٹلی والا کی مدد کرنے کے لیے آئے تھے، لیکن ان کے وہاں
پہنچنے سے پہلے ہی وہ خودکشی کر بیٹھے تھے ۔ کمرے میں بھی کوئی کام
کی چیز نہیں ملی تھی ۔ کمرے کا دروازہ تو انہوں نے خود توڑا تھا ۔
کھڑکیاں اندر سے بند ملی تھیں ۔ ان میں سلاخیں بھی لگی ہوئی تھیں ۔
لہذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کوئی شخص ان کے کمرے میں
داخل ہوا اور اس نے ان کا گلا گھونٹا اور کھڑکی کے راستے فرار
ہوگیا ! چنانچہ اکرام کو وہیں چھوڑ کر وہ وہاں سے رخصت ہوئے ۔

"خودکشی میری سمجھ میں نہیں آئی ۔" محمود نے موٹر سائیکلوں
کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ۔

"یہ خودکشی کیا، تمہاری سمجھ میں تو کبھی بھی کوئی بات نہیں

آتی ۔ فاروق نے منہ بنایا۔

"ہائیں ہائیں، یہ تم کہہ رہے ہو فاروق۔ اگر میں یہ جملہ تمہارے لیے کہتا تو ایک بات بھی تھی۔" محمود نے بُرا مانے بغیر کہا۔

"کبھی کبھی معاملہ الٹ بھی ہو جاتا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"خاص طور پر اس وقت جب ان کا دماغ الٹ جائے۔" فرزانہ نے چوٹ کی۔

"اور وہ نشان۔ کیا وہ نشان تمہاری سمجھ میں آگیا ہے۔" فاروق نے فرزانہ کا جملہ گویا سنا ہی نہیں۔

"نہیں، گھر کے افراد کا کہنا ہے کہ موت سے پہلے ان کی ہنسلی پر وہ سرخ نشان نہیں تھا۔ آخر مرنے کے بعد نشان کیوں ابھر آیا۔" محمود نے کہا۔

"بھئی، ہو سکتا ہے، اس جگہ جلد کے نیچے سانس رکنے سے کوئی رگ پھٹ گئی ہو۔" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں، اس کا امکان ہے، لیکن درست بات پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ہی معلوم ہوگی۔"

آخر وہ امجداے کریم کی کوٹھی تک پہنچ گئے۔ پتا انہیں پہلے ہی معلوم تھا۔ کوٹھی کے باہر ایک نوجوان سا آدمی بے تابی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے ٹہلنا بند کر دیا۔

"ہیلو، آپ لوگ کون ہیں؟"

"محمود، فاروق اور فرزانہ ہمارے نام ہیں۔ آپ کی تعریف۔" محمود نے کہا۔

"مجھے گیلانی رضا کہتے ہیں۔"

"یعنی امجداے کریم کے سیکرٹری۔ آپ نے دو بار ہمارے گھر فون کیا تھا۔ ابا جان ابھی تک نہیں لوٹے؛ چنانچہ ان کی بجائے ہم یہاں آگئے ہیں۔ ہم وہ کاغذ دیکھنا چاہتے ہیں، جس پر ہمارے والد کا نام لکھا ہوا ہے۔ دوسرے ہم لاش کا معائنہ بھی کریں گے۔"

"یہ کام پولیس والے شروع کر چکے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم بھی اپنے طور پر دیکھیں گے۔ ہمیں کمرۂ واردات تک لے چلیے۔"

"آئیے۔"

وہ انہیں لاش والے کمرے میں لے آیا۔ پولیس آفیسر نے نظر بھر کر انہیں دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ تصاویر وغیرہ لے رہے تھے اور انہیں شاید جانتے تھے۔ اس لیے کوئی سوال نہ کیا۔

تینوں نے پہلے اس کاغذ کو دیکھا۔ اس پر بہت جلدی کے عالم میں اور تھرتھراتے ہاتھوں سے انسپکٹر جمشید لکھا تھا، لیکن لکھا ہوا بالکل صاف پڑھا جا رہا تھا۔ انسپکٹر جمشید کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ شاید امجداے کریم کچھ اور لکھنے کی کوشش میں کامیاب

نہیں ہو سکے تھے۔ کاغذ قالین پر پڑا ملا تھا۔ لاش بھی قالین پر پڑی
تھی اور بالکل سر کوٹلی والا کی طرح اس کے بھی دونوں ہاتھ گلے پر
بُری طرح جمے ہوئے تھے۔ آنکھیں باہر کو اُبل آئی تھیں۔ منہ سے کسی
قدر پانی بھی بہہ نکلا تھا۔

وہ حیران رہ گئے، کیونکہ سر کوٹلی والا اور امجدلاے کریم بالکل
ایک جیسے طریقے سے مرے تھے۔ کمرہ بھی بالکل بند تھا اور توڑا گیا تھا۔
کھڑکیاں بھی بند ملی تھیں۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کوئی
شخص کمرے میں داخل ہوا ہوگا، اس نے ان کا گلا دبایا اور جب
وہ مر گئے تو ان کے ہاتھ ان کے گلے پر دبا کر چلتا بنا۔ دونوں ہاتھ
اس سختی سے گلے پر جم گئے تھے کہ ابھی تک الگ نہیں کیے جا
سکے تھے۔

ان کی حیرت میں اب خوف بھی شامل ہوتا جا رہا تھا۔ حالات
حد درجے پُراسرار اور خوفناک تھے اور سونے پر سہاگا یہ کہ ان
کے والد کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اچانک فرزانہ کے منہ سے نکلا:

"اُف، یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔"

محمود اور فاروق نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ فرزانہ کی
نظریں امجدلاے کریم کی ہنسلی کی ہڈی پر جمی تھیں۔ انہوں نے بھی ادھر
دیکھا اور پھر انہیں اپنے جسموں میں سنسنی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔
امجدلاے کریم کی ہنسلی کی ہڈی پر بھی ایک سرخ نشان چمک رہا

تھا۔ بالکل ویسا ہی نشان جیسا وہ سر کوٹلی والا کی ہنسلی کی ہڈی پر
دیکھ چکے تھے۔

ان کی سٹی گم ہوگئی۔ یہ اپنی نوعیت کی اتنی عجیب خودکشی
کے دو کیس تھے کہ ان کی زندگی میں اس قدر عجیب واردات کوئی
ہوئی ہی نہیں ہوگی۔ اگر دونوں لاشوں کی ہنسلی کی ہڈیوں پر سرخ
نشان نظر نہ بھی آتے تو بھی یہ کچھ کم عجیب وارداتیں نہ ہوتیں۔
کیونکہ کوئی بھی شخص اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔
خودکشی کرنے والے اس طرح خودکشی نہیں کرتے۔ یہ پہلے ہی کچھ
کم چکرا دینے والی بات نہیں تھی کہ سرخ نشان کا اور اضافہ ہوگیا۔

"گیلانی صاحب، آپ تو مدت سے ان کے ساتھ رہ رہے ہیں
کیا یہ نشان پیدائشی ہے۔"

"کون سا نشان؟" گیلانی رضا نے چونک کر کہا۔

"جی یہ دیکھیے۔" محمود نے نشان کی طرف اشارہ کیا۔

گیلانی رضا چند سیکنڈ تک نشان کو بغور دیکھتا رہا، آخر اس نے کہا:

"جہاں تک میرا خیال ہے، یہ نشان پہلے یہاں نہیں تھا۔"

"یقین کی حد تک بات معلوم کرنے کے لیے ان کے گھر کے

افراد کو بھی یہ نشان دکھا دیں۔"

"ہاں، یہ ضروری ہے۔"

پولیس آفیسر نے جلدی سے کہا۔ وہ بھی نشان کو دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہیں رہا تھا اور شاید اس نے یا اس کے عملے نے اس نشان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

گھر کے افراد کو لایا گیا۔ رو رو کر ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ انہوں نے اس نشان کو بغور دیکھا اور پھر سب نے باری باری یہی جواب دیا۔

"یہ نشان انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

تینوں اب کافی پریشان ہو گئے تھے۔ محمود نے یہ سوچ کر کہ شاید ان کے والد نے گھر فون کیا ہو، اپنے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی، لیکن ان کی امی نے ریسیور نہ اٹھایا۔ اب تو محمود اور بھی پریشان ہوا۔ اس نے بار بار کوشش کی اور پھر ریسیور رکھ کر بولا:

"عجیب بات ہے۔ گھنٹی بج رہی ہے، لیکن امی جان ریسیور نہیں اٹھا رہیں۔"

"خدایا خیر، کیا ادھر بھی کوئی گڑبڑ ہے۔" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

اور وہ افراتفری کے عالم میں گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ موٹر سائیکلوں

سے اتر کر انہوں نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ جب قدموں کی آواز سنائی نہ دی تو دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ دروازے کا کھلا ہونا کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ وہ ڈرے ڈرے انداز میں اندر داخل ہوئے۔

گھر میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ انہوں نے حیرت بھرے انداز میں ایک ایک کمرہ دیکھ ڈالا، لیکن بیگم جمشید گھر میں کہیں بھی نہیں تھیں اور پھر ان کی نظریں صحن والی میز پر رکھے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر جم گئیں۔

کاغذ پر لکھے الفاظ نے ان کے ہوش اڑا دیے، لکھا تھا:

"میں ہسپتال جا رہی ہوں۔ تمہارے والد شدید زخمی حالت میں ملے ہیں۔"

دوسرے ہی لمحے وہ موٹر سائیکلوں پر اڑے جا رہے تھے۔ ہسپتال کے کمرے کے دروازے پر ہی انہیں ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ برآمدے میں بہت سے لوگ موجود تھے، لیکن کمرے کا دروازہ بند تھا۔ یہاں تک کہ ان کی امی بھی باہر بیٹھی تھیں۔ وہاں نہ صرف خان رحمان اور پروفیسر داؤد موجود تھے، بلکہ آئی جی شیخ نثار احمد اور ڈی آئی جی افتخار احمد خان بھی بیٹھے تھے۔ ان سب کے چہرے ستے ہوئے تھے۔

تینوں کے دل ڈوبنے لگے۔ وہ اپنی امی کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور جواب طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"انہیں بہت بُری طرح زدوکوب کیا گیا ہے۔ پستولوں کے بٹوں سے مارا گیا ہے۔ ان کا تمام جسم زخموں سے پٹا پڑا ہے اور وہ مکمل طور پر بے ہوش ہیں۔ سانس بہت آہستہ لے رہے ہیں۔ اندر ڈاکٹروں کی پوری ٹیم موجود ہے، لیکن جو کام تمہاری دعائیں کر سکتی ہیں، وہ ڈاکٹر نہیں کر سکتے۔"

بیگم جمشید کی بھرائی ہوئی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ انہیں اپنے دل اور بھی ڈوبتے محسوس ہوئے۔ دل ہی دل میں وہ دعائیں مانگنے لگے۔

اچانک دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ آئی جی صاحب آگے بڑھے اور بولے:

"کیا حال ہے ڈاکٹر؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا خون بہت ضائع ہو چکا ہے اور اگر وہ چند منٹ اور سڑک پر پڑے رہتے تو زندگی کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس وقت تو خیر ہم امید رکھ ہی سکتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر ایک سمت میں چلا گیا۔ وہ پھر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک بکس تھا۔ بکس لے کر وہ پھر کمرے کے اندر چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔ اب کیس سے متعلق ان کے ذہنوں میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ صرف اور صرف

اپنے ابا جان کے بارے میں سوچ رہے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے۔

وقت گزرتا چلا گیا، لیکن چیونٹی کی چال سے۔ ان کے دل دھک دھک کرتے رہے۔ آخر کمرے کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ اس بار دو ڈاکٹر باہر نکلے۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

عجیب سا احساس

باس نے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا۔ تہ خانے میں سیڑھیوں سے کافی دور ہٹ کر ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا۔ سیڑھیوں کے قریب اس لیے نہیں جلایا گیا تھا تاکہ اوپر سے روشنی کی جھلک نظر نہ آئے۔ دس قدم چلنے کے بعد تہ خانے میں پانچ بستر لگے نظر آئے — وہ پانچوں ان پر گہری نیند سو رہے تھے۔ جیسے انہیں کسی قسم کا کوئی فکر نہ ہو —

"اٹھو تارے، میں نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے۔"

اس نے تیز آواز میں کہا — تارے کی آنکھ فوراً کھل گئی — اس نے باقیوں کو بھی جھنجوڑ جھنجوڑ کر اٹھا دیا — وہ باس کو تہ خانے میں دیکھ کر پریشان ہو گئے — اس وقت بھی باس کے چہرے پر نقاب تھا —

"خیر تو ہے باس۔"

"ہاں، سب خیریت ہے — انسپکٹر جمشید ہسپتال پہنچ چکا ہے۔

ڈاکٹر حضرات اسے بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اگر بچ بھی گیا تو ایک ماہ سے پہلے تو چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔"

"تب پھر تم نے ہمیں کیوں اٹھایا باس؟" تارے نے پوچھا۔

"اس کے بچے خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔"

"خطرناک ثابت ہو رہے ہیں، وہ کیسے؟" گنگو تیلی نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

"اس بات کو چھوڑو۔ میں چاہتا ہوں، ان کا بھی کانٹا نکال دیا جائے۔ انسپکٹر جمشید کی جلدی میں تو میں تمہاری مدد کو پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ کہیں وہ تمہارے قابو میں نہ آئے۔ آخر انسپکٹر جمشید کوئی معمولی آدمی تو ہیں نہیں۔ خیر، میرا خیال ہے تم تینوں بچوں پر تو آسانی سے قابو پا لو گے۔"

"آپ فکر نہ کریں باس، ہم ان کی چٹنی بنا دیں گے۔"

"اور چٹنی بھی اسی مکان میں بنانا، جہاں انسپکٹر جمشید کی خاطر تواضع کی تھی۔"

"جی بہتر۔" وہ ایک ساتھ بولے۔

"تمہاری آسانی کے لیے اتنا بتائے دیتا ہوں کہ وہ تینوں اس وقت ہسپتال میں ہے۔ جوں ہی وہ نکلیں، انہیں اسی عمارت کی طرف لے جانے کے منصوبے پر عمل شروع کر دینا۔"

"ایسا ہی ہو گا باس، لیکن ہم حیران ہیں کہ وہ آپ کے لیے

خطرناک کس طرح ثابت ہو رہے ہیں۔"

"ہر طرف کی خبریں مجھے برابر موصول ہو رہی ہیں۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

"تو کیا ہم اسی وقت روانہ ہو جائیں؟"

"ہاں، کیونکہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ انسپکٹر جمشید تو اس وقت تک ہوش میں ہی نہیں آیا۔ وہ تمہارے بارے میں کسی کو کیا بتائے گا۔"

وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے تہ خانے سے باہر نکل آئے۔ اور پھر اس کار میں بیٹھ کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے، جس میں سڑک سے بیٹھ کر باس کے گھر پہنچے تھے۔

"یہ ہمارا باس بھی عجیب ہے۔ پہلے انسپکٹر جمشید سے خوفزدہ تھا، اب اس کے بچوں سے۔"

"کچھ بھی ہو، ہے ذہین آدمی۔ میں تو اب تک حیران ہوں۔ اس نے ہمیں جیل سے کس طرح نکلوا دیا۔ ہم اس میدان میں کھدائی کرنے اس سے پہلے بھی تو روز ہی جاتے تھے، پھر اس روز نگرانی کرنے والے کیوں ہم سے دور ہو گئے۔ کیا نگرانی کرنے والوں کا تعلق باس سے ہے اور انہوں نے باس کی ہدایت پر ہمیں بھاگنے کی مہلت دی تھی۔"

"ہو سکتا ہے، یہی بات ہو۔ خیر ہمیں کیا، جیل کی زندگی سے یہ

زندگی بہر حال اچھی ہے۔ اچھا کھانے کو ملتا ہے، اچھا پہننے کو۔ اور پھر جب جی چاہتا ہے، رات کے وقت باہر بھی گھوم پھر آتے ہیں۔"

"کاش، ہمیں کم از کم اتنا ہی معلوم ہو جاتا کہ باس شہر میں کرتا کیا رہتا ہے۔ اس کے گھر کے دروازے پر نام کی پلیٹ بھی تو نہیں لگی ہوئی کہ ہم اس کا نام ہی جان سکتے۔"

وہ اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے آخر ہسپتال تک پہنچ گئے۔ کار انہوں نے قدرے فاصلے پر روک لی اور اس سے اتر کر آگے بڑھے۔

"ہسپتال کے کئی دروازے ہیں۔ کیوں نہ ہم ہر دروازے کی نگرانی کریں، تاکہ وہ جس دروازے سے بھی نکلیں، ہمیں معلوم ہو جائے۔"

"بھلا وہ کسی اور دروازے سے کیوں نکلنے لگے۔ سامنے کے دروازے سے ہی نکلیں گے۔" گنگو تیلی بولا۔

"بھئی، عقل کو ہاتھ مارو۔ وہ انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں۔ ہمارا باس تک ان سے خطرہ محسوس کرتا ہے۔" تارے نے کہا۔

"خیر، یونہی کر لیتے ہیں، لیکن اس طرح تو ان کے نکلنے کا صرف ایک آدمی کو پتا چلے گا۔" گنگو بولا۔

"ہم اپنا پرانا اشارہ استعمال کریں گے۔ یعنی وہ حلق سے الو کی آواز نکالے گا جسے تینوں نکلتے نظر آئیں گے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

"اور اب ترکیب سنو۔"

وہ اپنے کان اس کے منہ کے قریب لے آئے اور تارا کان میں انہیں بتانے لگا — اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ہر طرف مکمل طور پر سناٹا چھایا ہوا تھا — کبھی کبھار کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی — آخر وہ ایک ایک دروازے پر کھڑے ہو گئے، ہسپتال کے چار بڑے دروازے تھے۔ صدر دروازے پر ان میں سے دو موجود رہے۔

انہیں بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا — یہاں تک کہ اپنے باس پر غصہ بھی آیا — درمیان میں انہوں نے یہ بھی سوچا کہ کیوں نہ کسی ہوٹل کے کمرے میں جا کر آرام کریں اور صبح باس کو بتا دیں کہ وہ تینوں تو باہر نکلے ہی نہیں — لیکن پھر انہوں نے سوچا کہ باس تو پل پل کی خبر رکھتا ہے — کیا خبر ان کی اس حرکت کا پتا بھی اسے چل جائے۔ اس صورت میں ان کا ٹھکانا کہاں ہوگا — وہ ضرور کسی نہ کسی طرح انہیں دوبارہ جیل بھجوا دے گا؛ چنانچہ وہ اس خیال سے باز ہی رہے اور پھر دن نکل آیا — صبح کی روشنی پھیلنے لگی — ان کا مارے تھکن کے برا حال تھا — ایسے میں انہوں نے دیکھا، محمود فاروق اور فرزانہ صدر دروازے سے نکل کر اپنی موٹر سائیکلوں کا رخ کر رہے تھے — انہیں دیکھتے ہی لنگو تیلی نے منہ پر ہاتھ رکھا اور الو کی آواز نکال دی۔

"ڈاکٹر صاحب، اب کیا کیفیت ہے۔" آئی جی صاحب نے ڈوبتی آواز میں پوچھا —

"سانس کی آمد و رفت قدرے باقاعدہ ہوئی ہے، اب امید کی جا سکتی ہے کہ انہیں آدھ گھنٹے تک ہوش آ جائے گا۔"

"خدایا تیرا شکر ہے۔" ان سب کے منہ سے نکلا۔

اور پھر آدھ گھنٹے بعد ہی انہوں نے خوش خبری سنی کہ انہیں ہوش آ گیا ہے اور وہ کمرے میں آ سکتے ہیں۔ وہ سب بے تابانہ اندر داخل ہوئے — انسپکٹر جمشید کی آنکھیں کھلی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیے، پھر ان کی نظریں محمود، فاروق اور فرزانہ پر جم گئیں — ان کے ہونٹ حرکت کرنے لگے۔ آخر بہت ہی کمزور سی آواز منہ سے نکلی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ بہت کوشش کر کے بول رہے ہوں۔

"تم تینوں فوراً سر کوٹلی والا کے ہاں پہنچ جاؤ — ان کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"ہم وہاں جا چکے ہیں ابا جان، وہ ہمارے جانے سے پہلے ہی خودکشی کر چکے تھے۔"

"اوہ" ان کے منہ سے نکلا، پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولے:

"حیرت ہے۔ امجد اے کریم نے بھی خودکشی کر لی اور سرکوٹلی والا نے بھی۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے"

"آپ کو زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہییں جناب، اور ذہن پر زور دینے کی کوشش بھی نہ کریں" وہاں موجود ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں ڈاکٹر صاحب۔ اب میں ہوش میں آ چکا ہوں۔ اپنے بارے میں میں جانتا ہوں، بولنے یا ذہن پر زور دینے سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا" انہوں نے کہا۔ آہستہ آہستہ آواز میں کمزوری کے آثار ختم ہوتے جا رہے تھے۔

"عجیب بات یہ ہے ابا جان کہ دونوں نے بالکل ایک ہی طریقے سے خودکشی کی ہے، بالکل ایک انداز سے" محمود بولا۔

"اوہو کمال ہے، کیسے خودکشی کی انہوں نے؟"

"اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے گلے دبا لیے"

"نہیں" ان کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

"جی ہاں، بالکل یہی ہوا ہے"

"جمشید، تم نے ہوش میں آتے ہی کیس پر باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میرا خیال ہے، کیس کو بھول کر ان سب لوگوں سے بات کرو۔ دیکھو تو یہاں کون کون موجود ہیں" آئی جی صاحب نے پُر شفقت لہجے میں کہا۔

"ہم، یہ معاملہ کوئی عام معاملہ نہیں ہے، مجھے بلا وجہ اس حالت کو نہیں پہنچایا گیا۔ اگر میں سرکوٹلی والا تک پہنچ جاتا تو شاید انہیں تو بچا ہی سکتا تھا" انہوں نے کہا۔

"بھلا خودکشی کے کیسوں میں کیا پیچیدگی ہو سکتی ہے۔ اگر ان دونوں نے بالکل ایک طریقے سے خودکشی کی بھی ہے تو اسے بھی ایک اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے"

"لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیے کہ ایک ہی روز دو اہم ترین شخصیتیں چل بسیں اور پھر میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا چلوں کہ آج ہی دوپہر سرکوٹلی والا میرے دفتر میں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا، جیسے وہ خودکشی کر لیں گے"

"کیا مطلب؟" آئی جی اور ڈی آئی جی صاحبان نے ایک ساتھ چونکتے ہوئے انداز میں کہا۔

"جی ہاں، یہی تو عجیب ترین بات ہے۔ ٹھہریے، میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب، اب آپ جا سکتے ہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس زخم ٹھیک ہوتے تک ہسپتال میں رہوں گا"

ڈاکٹر نے انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

"کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دو محمود" انسپکٹر جمشید بولے۔

محمود نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور پھر انہوں نے کوٹلی والا کی کہانی

دبے لفظوں میں انہیں سنا دی۔

"یہ تو تم نے عجیب کہانی سنائی" خان رحمان پہلی مرتبہ بولے۔

"اس کہانی سے تو جرم کی بُو آرہی ہے۔ پروفیسر داؤد نے بھی زبان کھولی۔

"جی ہاں، اسی لیے میں پریشان ہوں۔ دفتر سے میں سیدھا سر کوٹلی والا کے ہاں جانے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن پھر ایک نوجوان نے میرا تعاقب شروع کر دیا۔ اسے سبق سکھا کر میں نے دفتر فون کیا۔ تاکہ اس کی نگرانی شروع کرائی جا سکے، لیکن دفتر سے مجھے بتایا گیا کہ امجد اے کریم صاحب نے خودکشی کر لی ہے اور وہاں ایک کاغذ پایا گیا ہے، جس پر میرا نام لکھا ہے؛ چنانچہ میں نے سوچا، پہلے ایک نظر جائے واردات کو دیکھ لوں، پھر سر کوٹلی والا کے ہاں چلا جاؤں، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ فون کر کے جب میں جیپ میں بیٹھا تو تارا نامی جیل سے بھاگا ہوا قاتل اندر موجود تھا۔ جیپ کے چلتے ہی اس نے میری گدی پر پستول کی نالی رکھ دی۔ میں یہ سوچ کر اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا رہا کہ دیکھوں یہ مجھے کہاں لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اس جگہ اس کے دوسرے ساتھی بھی ہوں گے اور اس طرح انہیں دوبارہ گرفتار کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

اس کے بعد انہوں نے وہ سب کچھ تفصیل سے سنا دیا جو اُن

کے ساتھ ہوا تھا۔

"ابا جان، ان پانچوں کے حلیے بتا سکتے ہیں آپ؟" محمود نے سرسری انداز میں کہا۔ وہ اس کی بات سُن کر مسکرائے اور بولے:

"ہاں، بتا سکتا ہوں، لیکن بتاؤں گا نہیں۔"

"جی کیا مطلب؟" محمود نے جلدی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں، تم ان پانچوں سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہو گئے ہو، لیکن اس کی اتنی ضرورت نہیں۔ تمہارے لیے کچھ ضروری کام ہیں کرنے کے لیے۔ سب سے پہلے تو تم اس جنگل میں اس عمارت کو چیک کرو۔ اکرام کو ساتھ لے جانا۔ وہاں سے انگلیوں کے نشانات وغیرہ بھی اٹھوانے ہیں، کوئی اور کام کی چیز ملے تو وہ بھی قبضے میں کر لینا۔ اس کے بعد تم اس نجومی کو چیک کرو گے اور پھر اس کیس کے سلسلے میں جو بھی ہو سکے کرتے رہنا۔ میں تو تمہیں مشورہ ہی دے سکوں گا۔ ہاں، نجومی کا پتا نوٹ کر لو۔" یہ کہہ کر انہوں نے پتا نوٹ کرا دیا۔

"آپ فکر نہ کریں، ہم آپ کے مشوروں کی روشنی میں انشاءاللہ اس کیس کو حل کر کے دکھائیں گے۔ اور ہاں، ہم دو باتیں تو آپ کو بتانا بھول ہی گئے۔ پہلی تو یہ کہ ہم نے سر کوٹلی والا اور امجد اے کریم کی ہنسلی کی ہڈیوں پر ایک سرخ چمکیلا نشان دیکھا ہے۔ دونوں کے گھر والوں کا کہنا یہ ہے کہ موت سے پہلے یہ نشان ان کے

جسموں پر ہرگز نہیں تھا۔"

"اوہ" ان کے منہ سے نکلا۔

"دوسرے یہ کہ جس نوجوان نے آپ کا تعاقب کیا تھا اور جس کی کار کا ٹائر آپ نے پنکچر کیا تھا، وہ فوراً بعد ہی ہمارے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ آپ سے ایک ٹائر کی پنکچر لگوائی اور ٹیکسی کا آنے جانے کا بل وصول کرنا چاہتا ہے، اس نے کچھ دیر ڈرائنگ روم میں آپ کا انتظار بھی کیا تھا، لیکن جب ہمیں سرکوٹھی والا کا فون موصول ہوا تو ہم گھر میں نہ رک سکے، اس لیے اس سے بھی رخصت ہونے کی درخواست کی۔" محمود بتاتا چلا گیا۔

"کیا وہ تمام وقت تمہاری نظروں کے سامنے رہا۔ تم اسے اکیلا چھوڑ کر ڈرائنگ روم سے باہر گئے تھے؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"جی کچھ یاد نہیں۔ ٹھہریے، ذرا ہم یاد کرلیں۔" محمود نے پیشانی کی طرف ہاتھ لے جاتے ہوئے کہا۔

"مجھے یاد ہے ابا جان، ہم نے اسے ایک منٹ کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔" فرزانہ بولی۔

"تب بھی تم ڈرائنگ روم کی اچھی طرح تلاشی لوگے۔ ہوسکتا ہے، اس نے نظر بچا کر کوئی چیز وہاں چپکا دی ہو۔"

"جی بہتر۔"

اور پھر دن نکلنے پر ہی وہ وہاں سے نکلے۔ باقی حضرات کا ابھی

جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی اس لیے نکلنا پڑا کہ انہیں بہت سے کام انجام دینے تھے۔ جوں ہی وہ اپنی موٹر سائیکلوں تک پہنچے، ان کے کانوں سے الو کی آواز ٹکرائی۔ انہوں نے حیرت بھرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"محمود، یہ الو کی آواز تم نے منہ سے نکالی ہے؟" فرزانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اتنی بھونڈی الو کی آواز بھلا میں کس طرح نکال سکتا ہوں۔" محمود نے منہ بنا کر کہا۔

"تو یہ ضرور فاروق کے منہ سے نکلی ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں الو کی آواز بھونڈی نکالتا ہوں۔ اور خود تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میرے منہ سے الو کی سریلی آواز نکلتی ہے۔"

"لو اب الو کی آواز بھی سریلی ہونے لگی۔" فاروق جل کر بولا۔

"ختم کرو۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ آواز ہم میں سے کسی نے نہیں نکالی۔ شہر میں الو پائے نہیں جاتے، پھر اس آواز کا یہاں کیا کام۔ ابا جان کی آواز بھی ایسی نہیں ہے اور پھر ہسپتال کے بند کمرے سے یہاں آواز پہنچ بھی نہیں سکتی۔ یہ کسی انسانی آواز نے الو کی آواز کا جامہ پہنا ہے؛ گویا ہمیں خبردار ہو جانا چاہیے، کیونکہ الو کی آواز اصلی ہو یا نقلی، منحوس ضرور ہوتی ہے۔" فاروق جلدی جلدی

کہتا چلا گیا۔

"محمود، تم نے دیکھی اس کی زبان کی رفتار" فرزانہ تلملا کر بولی۔

"ہاں دیکھی، لیکن اس نے غلط نہیں کہا۔۔۔ میں بھی خطرے کی بُو سونگھ رہا ہوں"

"تو پھر کیا اندر چلیں" فرزانہ نے ان کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"یہ کیا بات ہوئی، آؤ دیکھتے ہیں"

وہ موٹر سائیکلوں پر بیٹھ گئے اور پھر باہر نکل آئے۔ دروازے کے سامنے انہوں نے دو غنڈہ صورت آدمیوں کو کھڑے دیکھا۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد انہوں نے ایک کار کو اپنے تعاقب میں دیکھا۔

"لو بھئی تعاقب شروع ہو گیا ہے، لہٰذا ہم سیدھے اپنے گھر جائیں گے" محمود نے دبی آواز میں کہا۔

"اور مزے کی بات یہ ہے کہ کار میں پانچ غنڈے موجود ہیں" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"خدا کرے، یہ مزے کی بات ہی ثابت ہو" فرزانہ نے سوچ میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" محمود چونکا۔

"اگر یہ وہی پانچوں ہیں تو پھر ان کا باس بھی ان کے پیچھے

ہو گا۔۔۔ وہ مکار ہے، چھپ کر وار کرتا ہے"

"دیکھا جائے گا۔۔۔ ہم ان سے ابا جان کا انتقام ضرور لیں گے" فاروق نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"لیکن ابا جان کا خیال ہے کہ ہمارے لیے کچھ ضروری کام ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے اس عمارت کو چیک کرنا ہے اور پھر اس نجومی کے ہاں جانا ہے" فرزانہ نے کہا۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہم انہیں چکر دے کر نکل جائیں" محمود نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اس وقت یہی مناسب ہے۔۔۔ دیکھو نا، ابا جان بھی یہی سوچ کر ان کے ساتھ چلے گئے تھے کہ دیکھیں یہ انہیں کہاں لے کر جاتے ہیں اور وہ انہیں گرفتار کرا دیں گے، لیکن ہوا اس کے الٹ۔۔۔ اب اگر ہماری باری میں بھی الٹ ہو گیا، تو پھر کیس پر کام کرنے کے لیے کون رہ جائے گا، تو کیوں نہ پہلے ہم اس کیس کا کام تمام کر دیں اور اس کے بعد ان سے ٹکر لیں۔ یہ لوگ بھی بلا وجہ تو ہمارے پیچھے لگے نہیں۔۔۔ انہیں ہماری طرف سے بھی خطرہ محسوس ہوا ہو گا" فرزانہ نے بالکل انسپکٹر جمشید کے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، ہمیں تمہاری تجویز منظور ہے۔۔۔ اب سوال یہ ہے کہ ان سے پیچھا کس طرح چھڑائیں" فاروق بولا۔

"یہ کیا مشکل ہے، جوں ہی کوئی تنگ سی گلی آئے، موٹر سائیکلیں

اس میں موڑ دینا۔ یہ بے چارے کار میں ہیں، بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔"

"بھئی کتنی پیاری ترکیب ہے۔ واقعی ترکیبیں سوچنے میں تمہارا کوئی جواب نہیں۔" محمود نے سچے دل سے اس کی تعریف کی۔

"تو یوں کیوں نہیں کہتے، اس نے ترکیبیں بتانے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"سال ختم ہونے والا ہے۔ اس مرتبہ یہ ٹھیکا تم لے لینا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" فرزانہ مسکرائی۔

اسی وقت محمود نے موٹر سائیکل بائیں ہاتھ کی ایک گلی میں موڑ دی۔ گلی پتلی سی تھی اور کار اس میں داخل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ فاروق نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اور پھر وہ رفتار بڑھاتے چلے گئے۔ گلیوں ہی گلیوں میں چلتے وہ ایک سڑک پر نکل آئے اور ایک پبلک فون بوتھ کے سامنے رک گئے۔ محمود نے اکرام کو فون کیا:

"ہیلو انکل، کیا آپ کو ابا جان کے زخمی ہونے کی اطلاع مل چکی ہے؟"

"ابھی ابھی پتا چلا ہے۔ میں رات بھر کا تھکا ماندا صبح سویرے گھر جا کر سو گیا تھا۔ ابھی ابھی دفتر پہنچا ہوں تو پتا چلا۔" اس نے بتایا۔

"ہم اس وقت برٹ روڈ پر موجود ہیں۔ آپ فوراً یہاں آ جائیں اور اپنے ساتھ پورا عملہ بھی لے آئیں۔"

"لیکن میں تو انسپکٹر صاحب کی عیادت کے لیے جانے والا تھا۔"

"عیادت آپ بعد میں کر لیجیے گا۔ ابا جان پہلے سے بہت بہتر ہیں۔"

"اچھا، میں آ رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ پولیس کی جیپ کے ساتھ ساتھ اپنی موٹر سائیکلوں پر بیٹھے اس عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ جس کا پتا انہیں انسپکٹر جمشید نے بتایا تھا۔ عمارت انہیں خالی ملی۔ اس کے ایک ایک گوشے کی تصاویر لی گئیں۔ فرش پر پھیلے ہوئے انسپکٹر جمشید کے خون کی بھی تصاویر لی گئیں۔ انسپکٹر جمشید کی ران میں سے نکلنے والی گولی پہلے ہی قبضے میں کی جا چکی تھی۔ فرش پر انہیں جوتوں کے نشانات بھی صاف نظر آئے تھے، کیونکہ فرش گرد آلود تھا۔ غور سے دیکھنے پر انہیں معلوم ہوا کہ کمرے میں سات آدمیوں کے جوتوں کے نشانات موجود تھے۔

"ان میں سے ایک تو ابا جان کے جوتوں کے نشان ہیں۔ پانچ حملہ آوروں کے ہیں۔ تو پھر — یہ ساتواں نشان کیا باس کا ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا ہے۔ وہ گنگو تیلی وغیرہ کی موجودگی میں کمرے میں نہیں آیا تھا، لیکن شاید سب کے جانے کے بعد اندر آیا ہوگا اور اس نے کمرے کا جائزہ بھی لیا ہوگا۔" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ضرور یہی بات ہے۔" اکرام بولا۔ وہ اکرام کو ساری کہانی اس وقت تک سنا چکے تھے۔

چنانچہ سب جوتوں کے نشانات کے فوٹو بہت احتیاط سے لیے گئے۔ آخر وہ سب وہاں سے رخصت ہوئے۔۔

"اب ہم تو پہلے گھر جائیں گے انکل، آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"میں پہلے دفتر، اور دفتر سے ہسپتال جاؤں گا۔"

جونہی وہ گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ انہیں ایک عجیب سا احساس ہوا۔

مقابلہ

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

"معلوم ہوتا ہے، گھر میں کوئی ہم سے پہلے ہی موجود ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ہاں، امی جان تو ہو نہیں سکتیں۔" محمود بولا۔

"اور نہ پروفیسر انکل یا انکل خان رحمان ہو سکتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"تب پھر یہ وہی پانچوں ہیں۔" محمود نے گویا نتیجہ نکالا۔

"خیر، اس مرتبہ یہ اچھی جگہ آ گئے ہیں۔ دروازہ اندر سے بند کر دو اب انہوں نے ہمیں انتقام پر مجبور کر ہی دیا ہے تو ہم کیا کریں۔ انتقام سے زیادہ تو اسے اپنا بچاؤ کہا جا سکتا ہے ۔۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہم اپنا بچاؤ نہیں کریں گے ۔۔ ہم صرف انتقام لیں گے۔ ایک ایسا انتقام کہ ان کی آیندہ نسلیں......" فرزانہ پرجوش لہجے میں کہتی جا رہی تھی کہ

فاروق نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس بس۔ باتیں کرنے کی بجائے ہمیں کام کرنا ہے۔ پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ان کا باس بھی ان کے ساتھ ہے یا نہیں۔ تم اپنی بلی کو آواز دو۔ میں کھلونوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

فرزانہ نے منہ سے ایک ہلکی سی سُریلی آواز نکالی۔ فوراً ہی بلی ان کے کمرے سے نکل کر ان کی طرف آتی نظر آئی اور پھر فرزانہ کی ٹانگوں سے اپنے جسم کو رگڑنے لگی۔

"تم دونوں بلی کے ساتھ صحن کا رخ کرو، میں اپنے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ صاف ظاہر ہے، وہ صحن میں کہیں چھپے ہوئے ہوں گے۔" محمود بولا۔

دونوں صحن کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ محمود اپنے کمرے کی طرف لپکا اور اس طرح لپکا کہ آواز پیدا نہ ہو سکی۔

جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوا، اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ کمرے میں دو بدمعاش کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ دونوں پستولوں کی نالیں ان کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ دھک سے رہ گیا۔

ادھر فاروق اور فرزانہ بلی کے ساتھ صحن والی میز کے قریب پہنچے تو ڈرائنگ روم کی دیوار کی اوٹ سے تین بدمعاش نکلتے نظر آئے۔ ان کے منہ صحن کی طرف ہی تھے۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں تین پستول تھے اور ان کی نالوں کا رخ ان کی طرف تھا۔

"ہم نے سوچا، آخر تم یہاں تو واپس آؤ گے ہی۔" ان میں سے ایک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک سوچا تھا۔ تمہاری سوچ قابلِ تعریف ہے۔" فاروق چہکا۔

فرزانہ نے منہ سے سیٹی کی ایک اتنی ہلکی آواز نکالی کہ تینوں بدمعاشوں تک نہ پہنچ سکی۔ بلی نے چونک کر تینوں بدمعاشوں کو دیکھا۔ فرزانہ نے اس آواز کے ذریعے اسے خطرے کا احساس دلایا تھا۔ بلی بھی ان پستولوں کا مطلب سمجھ گئی اور پھر وہ ان کے پاس سے ہٹ کر دائرے کی صورت میں ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔ وہاں سے پلٹ کر وہ ان تینوں کی طرف بڑھی۔

"بھئی فاروق، یہ لوگ اپنی تعریف سننے یہاں نہیں آئے۔" فرزانہ نے انہیں باتوں میں لگائے رکھنے کے لیے کہا۔

"تو اور کیا سننے کے لیے آتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے، ہمارے ابا جان گانے بجانے کے خلاف ہیں۔"

"مجھے تو معلوم ہے، لیکن یہ بات انہیں بھلا کس طرح معلوم ہو سکتی تھی۔ ہاں، تم نے بتائی ہے تو معلوم ہو گئی ہو گی۔" فرزانہ بولی۔

"معلوم ہو گئی ہو گی۔ کیا اب بھی اس بات میں شک رہ گیا ہے۔"

"اچھا اب بال کی کھال اتارنے پر لعنت بھیجو اور ان لوگوں سے کوئی بات کرو۔ آخر یہ ہمارے مہمان ہیں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"ہاں، مہمان تو خیر ہیں — آئیے جناب، صحن میں بچھی کرسیوں پر تشریف رکھیے۔ اس کے بعد ہم آپ لوگوں کی خاطر مدارات کا کچھ انتظام کریں گے۔" فاروق نے چہکتی آواز میں کہا۔

"تم لوگ ہسپتال میں اپنے باپ کا حشر دیکھ چکے ہو۔"

"ہاں خدا کی مہربانی سے وہ اب ہوش میں ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"اور یہ صرف ہماری مہربانی سے ہوا۔ ہم نے جان بوجھ کر اسے جان سے نہیں مارا۔"

"چلو ہم تمہارا بھی شکریہ ادا کیے دیتے ہیں۔ فرزانہ تم بھی شکریے کے الفاظ کہہ دو تاکہ انہیں ہم سے کوئی گلا نہ رہ جائے۔"

"میں بھی آپ لوگوں کی شکر گزار ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ اب ہم تم تینوں کو ہسپتال پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"لیکن کیوں، ابا جان سے تو ہم مل آئے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"بس تمہاری ہڈیاں اور پسلیاں ذرا توڑیں پھوڑیں گے۔"

عین اسی وقت بلی نے ان کے سروں پر چھلانگ لگائی۔ وہ بوکھلا گئے — ان کے خیال میں تو ادھر سے ان پر حملہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ دیوار سے لگے کھڑے تھے، لیکن بلی نے تو ان کے

دائیں پہلو سے چھلانگ لگائی تھی اور پلک جھپکتے میں ان کے سروں پر پہنچ گئی تھی۔ پہلے ایک کے سر پر، پھر دوسرے کے اور پھر تیسرے کے۔ فاروق اور فرزانہ کے لیے اتنا موقع ہی کافی تھا۔ انہوں نے لوٹ لگائی اور باورچی خانے کی طرف لڑھکتے چلے گئے۔ تینوں دشمنوں کو ان کی طرف دھیان دینے کا ہوش ہی کہاں تھا بھلا — وہ تو سر پر ٹوٹنے والی مصیبت کی فکر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بلی تھی کہ اپنے ناخنوں سے ان کے مزاج پوچھ رہی تھی۔ پھر جوں ہی ان میں سے ایک نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ وہ فرش پر آ رہی۔ فرش پر گرتے ہی ایک بار پھر اس نے ان پر چھلانگ لگائی۔ اس کے ساتھ ہی ان میں سے ایک نے گھبراہٹ کے عالم میں اس پر فائر جھونک مارا۔ بلی نے فوراً ہی دوسری طرف چھلانگ لگائی۔ اور دوسرے ہی لمحے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پستول سے بے آواز فائر ہوا تھا؛ گویا انہوں نے سائلنسر چڑھا رکھے تھے۔

"ارے، وہ دونوں کہاں چلے گئے؟"

"میں نے انہیں اس طرف جاتے دیکھا تھا۔" ایک نے باورچی خانے کی طرف اشارا کیا۔

"ارے، وہ بلی، وہ کہاں گئی۔ عجیب بلی تھی۔"

"اسے میں نے اس طرف چھلانگ لگاتے دیکھا ہے۔" دوسرے

نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارا کیا۔

"بلی کو چھوڑو، ہمیں تو ان کی خبر لینی ہے۔ آؤ۔"

تینوں باورچی خانے کی طرف بڑھے۔

○

چند سیکنڈ تک انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد محمود نے آواز کو پرسکون بناتے ہوئے کہا۔

"ہیلو دوستو، کیا پروگرام ہے؟"

"پروگرام بہت خونی ہے۔" ایک بولا۔

"میرا بھائی فاروق اس وقت میرے ساتھ نہیں، ورنہ وہ یہ ضرور کہتا، یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"کون سا نام؟"

"یہی، خونی پروگرام۔"

"جو حال تمہارے ابا جان کا ہوا ہے، اب وہی ہم تمہارا کریں گے۔"

"شکر ہے، تم لوگ خود ہی آ گئے، ہمیں تلاش نہیں کرنا پڑا۔" محمود ہنسا۔

"تو تم ہمیں تلاش کرنا چاہتے تھے؟"

"ہاں، ہمیں تم سے اپنے والد کا انتقام لینا ہے۔"

"تم تین، ہم پانچوں سے انتقام لو گے؟" ان میں سے ایک نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"پروگرام تو یہی ہے۔"

"تو پھر لو انتقام — کھڑے ہمارا منہ کیا تک رہے ہو؟"

"اگر اتنے ہی بہادر ہو تو پستول جیب میں رکھ لو — میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں بھی کوئی پستول استعمال نہیں کروں گا یا پھر مجھے بھی ہتھیار نکال لینے دو۔"

"ہمیں تمہاری پہلی بات منظور ہے۔ یہ لو ہم پستول جیب میں رکھ رہے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ تم پر پستول استعمال کریں گے۔"

"بہت بہت شکریہ — یہ ہوئی نا بات۔" محمود خوش ہو کر بولا۔

پستول جیب میں رکھتے ہی وہ ایک ایک قدم اٹھاتے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ محمود نے تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا، پھر اس سے پہلے کہ وہ اس کے نزدیک پہنچتے، وہ دھڑام سے فرش پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

"ارے اسے کیا ہوا۔"

"شاید خوف سے اس کی جان نکل گئی"

"یا پھر بے ہوش ہو گیا ہے"

دونوں اس پر جھکے اور پھر دونوں ایک ساتھ چیخے۔ محمود کی دونوں ٹانگیں ان کے منہ پر پورے زور سے لگی تھیں۔ ایک کے منہ پر ایک ٹانگ اور دوسرے کے منہ پر دوسری ٹانگ — وہ سنبھل نہ سکے اور دوسری طرف الٹ گئے۔ محمود فوراً کپڑوں والی الماری میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

جب وہ خود کو سنبھال کر اس طرف مڑے جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ ساکت گرا پڑا تھا تو اسے غائب پایا۔

"ارے، وہ شاید کمرے سے نکل گیا۔"

"آؤ جلدی کرو" ایک نے کہا اور دونوں دوڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔ ادھر ان کے تینوں ساتھی صحن سے ہو کر باورچی خانے کا رخ کر رہے تھے — ان کے دوڑتے قدموں کی آواز سن کر مڑے۔

"کیا ہوا؟"

"وہ ہمارے ہاتھ سے بچ کر کمرے سے نکل آیا ہے"

"لیکن ہم نے تو اسے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا"

"تب پھر وہ ضرور کمرے میں ہی کہیں ہو گا۔ شاید مسہریوں کے نیچے" ان دونوں میں سے ایک نے کہا اور واپس مڑے — دوسرے ہی لمحے وہ بھنا اٹھے، کیونکہ کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

ادھر وہ باورچی خانے کے دروازے پر پہنچے اور دروازے کو بند پا کر تلملا اٹھے۔ اچانک ایک چہکتی آواز سنائی دی۔

"ہیلو دوستو کہو، اب کیا حال ہے؟"

آواز باورچی خانے کے دروازے کے سوراخ میں سے آئی تھی۔

"تالے کے سوراخ پر پستول رکھ کر فائر کرو" ان میں سے ایک نے غرا کر کہا۔

"نہیں گنگو، اس سے تالا ضرور ٹوٹ جائے گا، دروازہ نہیں کھل سکے گا — ہمیں یہ دونوں دروازے توڑنا ہوں گے" یہ تارے کی آواز تھی —

"ٹھیک ہے — ہم پہلے باورچی خانے والا دروازہ توڑیں گے۔ ان کا بھائی جو اس کمرے میں ہے۔ خود بخود ان کی مدد کرنے آئے گا" گنگو تیلی نے کہا۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کھڑکی کے ذریعے باہر نکل کر پولیس کو فون کرنے چلا گیا ہو"

"اوہ، پہلے تو ہمیں اس کا انتقام کرنا چاہیے۔ آؤ"

یہ کہہ کر وہ صدر دروازے کی طرف مڑے۔ دوڑ کر وہاں پہنچے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے، پھر تارے کی آواز سنائی دی۔

"بے وقوف نہ بنو۔ کم از کم دو آدمی اندر ہی رہو۔ ابھی ان میں سے دو باورچی خانے میں ہیں اور ان کے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں

ہے۔"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔"

فوراً ہی دو آدمی اندر آگئے۔ باقی تین باغ کی طرف گئے۔ انہوں نے دیکھا، کھڑکی کھلی ہے اور کمرے میں کوئی نہیں تو گنگو فوراً ہی چلا اٹھا:

"وہ یقیناً پولیس کو خبر کرنے گیا ہے۔"

"تو پھر آؤ یہاں سے بھاگ چلیں۔ ان سے پھر کبھی نبٹ لیں گے۔"

"اندر والے دونوں ساتھیوں کو بلا لو۔"

وہ صدر دروازے پر آئے اور پھر بُری طرح چکرا گئے۔

ایک یا دو

تین کے نکلتے ہی کمرے کے روشن دان میں سے کوئی چیز ان دو پر گری۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ ایک گیند تھی۔ زمین پر گرتے ہی وہ اوپر اٹھی اور پھر تیزی سے گرنے اور اچھلنے لگی۔ دونوں کی نظریں اس کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے ہونے لگیں۔ وہ حیران تھے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ عین اسی وقت ایک پیپر ویٹ روشندان میں سے تیر کی طرح آیا اور ان میں سے ایک کے سر سے ٹکرا گیا۔ اس کے حلق سے دبی دبی چیخ ہی نکل سکی اور پھر وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ دوسرے نے گھبرا کر روشن دان کی طرف دیکھا، ساتھ ہی ایک اور پیپر ویٹ آتا نظر آیا۔ اس نے تیزی سے خود کو بچانے کی کوشش کی، لیکن دیر ہو چکی تھی۔ پیپر ویٹ پوری قوت سے اس کی پیشانی پر لگا اور وہ بھی نیچے گر گیا۔

اس ساری کارروائی میں صرف چند سیکنڈ صرف ہوئے اور پھر فوراً ہی دروازہ کھلا، محمود مسکراتا ہوا باہر نکلا اور باورچی خانے کے

دروازے پر آیا۔

"تم دونوں اندر کیا کر رہے ہو؟"

"کھانا کھا رہے ہیں۔" فاروق کی آواز آئی۔

"یہ کھانا کھانے کا کون سا وقت ہے؟"

"جب بھوک لگ جائے، کھانا کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"اچھا بس۔ میں نے ان میں سے دو کو بے ہوش کر دیا ہے اور باقی تین اب گھر سے باہر ہیں۔ آؤ ان کی بھی خبر لے لیں۔"

"ہمیں امید تھی کہ ان پانچوں کے لیے تم اکیلے ہی کافی ثابت ہوگے، کیونکہ یہ ہمارا گھر ہے۔ ان کی جنگل والی عمارت نہیں۔"

وقت ضائع نہ کرو۔ اگر وہ اپنے دو ساتھیوں کو چھوڑ کر بھاگنے کا پروگرام بنا بیٹھے تو ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔"

"اور کیا، ہاتھ ملنا تو ہے ہی بری بات۔" یہ کہہ کر فاروق نے دروازہ کھول دیا۔ اب تینوں چھت پر پہنچے۔ یہاں ایک طرف چند اینٹیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ انہوں نے ایک ایک اینٹ اٹھائی اور دروازے کی طرف آئے۔ منڈیر سے جھک کر دیکھا تو وہ تینوں دبی آواز میں اپنے دونوں ساتھیوں کو آوازیں دے رہے تھے۔

"چلو بھئی، نشانہ لو، دیکھو، تین وہ ہیں اور تین ہی ہم ہیں۔ ہم میں سے کسی کا نشانہ خطا نہیں جانا چاہیے۔" محمود نے سرگوشی کی۔

انہوں نے ایک ساتھ تینوں اینٹیں ان کے سروں کے اوپر پھینک دیں۔ فوراً تین چیخیں فضا میں ابھریں اور اس کے ساتھ ہی بیگم شیرازی کا دروازہ کھلا۔

"یہ چیخیں کیسی تھیں؟"

پھر ان کی نظر دروازے پر پڑے تین زخمی آدمیوں پر پڑیں اور وہ خوف زدہ ہو گئیں۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں آنٹی، ہم ذرا آج شکار کھیلنے کے موڈ میں ہیں۔ ہم نے ان تینوں کو شکار کیا ہے۔" فاروق نے اوپر سے کہا۔ انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا اور پھر حیران ہو کر بولیں۔

"اف خدا، تم اوپر ہو۔ تمہارے گھر میں رات بھر مکمل تاریکی رہی۔ دروازہ بھی باہر سے بند تھا۔ میں رات بھر پریشان رہی اور یہ نیچے کیا معاملہ ہے۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

"ابھی بتاتے ہیں آنٹی۔" وہ نیچے اتر آئے۔ ان تینوں کو بھی گھسیٹ گھسیٹ کر اندر لائے، پھر اکرام کو فون کیا اور بیگم شیرازی کو ساری بات سنانے لگے۔

"اوہو، تو بھائی جان ہسپتال میں ہیں، تب تو مجھے فوراً وہاں جانا چاہیے۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ گئی ہی تھیں کہ اکرام پہنچ گیا۔ اس نے ان پانچوں کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔

"یہ یہاں کس طرح پہنچ گئے۔"

"ہمارا انتظام کرنے آئے تھے" فاروق مسکرایا۔

"لیکن تم نے ان پر قابو کس طرح پایا۔ یہ تو بہت خطرناک ہیں۔ دیکھتے نہیں انہوں نے انسپکٹر صاحب کا کیا حال کر دیا ہے"

"وہ ان کی وجہ سے نہیں، اس گولی کی وجہ سے ہوا جو چھپ کر ماری گئی اور ایسا ان پانچوں کے باس نے کیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ ہم نے ان پر قابو کس طرح پایا، تو بات صرف اتنی سی ہے انکل، کہ یہ ہمارے گھر میں آ گئے تھے، ورنہ ہم بھی ان پر اتنی آسانی سے قابو نہ پا سکتے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ان کی شامت آ گئی تھی جو انہوں نے ادھر کا رُخ کیا۔"

اس کے بعد انہوں نے قابو پانے کی تفصیل سنا دی — اکرام مسکرانے لگا۔ وہ اپنے ساتھ چند ماتحتوں کو بھی لایا تھا۔ انہوں نے ان پانچوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

"ہم ان کے ذریعے باس تک پہنچ سکتے ہیں" محمود نے کچھ سوچ کر کہا۔

"پھر، کیا تم چاہتے ہو، ابھی انہیں حوالات نہ پہنچایا جائے"

"ہاں، کم از کم ان کے ہوش میں آنے تک انہیں یہیں رکھا جائے تو بہتر ہے"

"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی"

"تو کیوں نہ ہم خود ہی انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کریں۔

دوسرے یہ کہ ہمیں ان کی مرہم پٹی بھی کر دینی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ خون بہنے کی وجہ سے مر ہی جائیں۔ ابھی ان سے ہمیں کام لینا ہے۔ عدالت میں گواہیوں کی ضرورت بھی تو پڑتی ہے" فرزانہ نے کہا۔

"یہ ٹھیک رہے گا"

اور انہوں نے ان پانچوں کو ہوش میں لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے گنگو تیلی ہوش میں آیا۔

"ہیلو، اب تمہارا کیا حال ہے" فاروق نے چہکتی آواز میں پوچھا۔

گنگو تیلی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔

"بھئی یوں خاموش رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔ تم پانچوں اب ہمارے قبضے میں ہو۔ اس مرتبہ تمہارے باس کا بھی دور دور تک پتا نہیں۔ وہ تمہاری مدد کے لیے یہاں تو پہنچا نہیں۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ مایوس ہی ہو جاؤ اور ہمیں یہ بتا دو کہ باس کون ہے" فاروق بولا۔

"ہم، ہم نہیں جانتے — ہم نے اسے آج تک نہیں دیکھا"

"اس کا ٹھکانا تو تم ضرور جانتے ہو" محمود نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھکانا" گنگو تیلی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں، اب چھپانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تم تو اب گرفتار ہو ہی

چکے۔ تمہیں اب جیل یا پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" محمود بولا۔

"تم - تم بے وقوف ہو۔" گنگو تیلی نے انگلی نچا کر کہا۔

"بھئی بہت خوب، یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہی - میں خود بھی اسے یہی سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"چپ رہو، کام کی بات کرنے دو۔" محمود نے جھلا کر کہا۔ پھر وہ گنگو سے بولا:

"یہ بات تم نے کیسے کہی کہ میں بے وقوف ہوں؟"

"ہاں، ہم پہلے بھی تو جیل میں تھے، پھر جیل سے کس طرح نکل آئے۔ ہمارا باس ہمیں پھر جیل سے نکلوائے گا۔ یہ کام اس کے لیے چٹکی بجانے جتنا آسان ہے۔"

"تو تمہارے باس نے تمہیں جیل سے نکلوایا تھا؟" اکرام نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔"

"تو کیا جیل جانے سے پہلے بھی وہ تمہارا باس تھا؟" محمود، فاروق اور فرزانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

"ہاں!" اس نے اکڑ کر کہا: "ہم نے جو قتل کیا تھا، وہ اسی کے اشارے پر کیا تھا۔ اس کا وعدہ بھی یہی تھا کہ اگر پولیس نے انہیں پکڑ بھی لیا تو بھی وہ انہیں جیل سے نکلوائے گا اور اس نے ہمیں

نکلوا لیا۔ اب اگر ہمیں پھر جیل بھیج دیا گیا تو وہ پھر نکلوا لے گا۔ اس لیے ہم تم لوگوں کو اس کے ٹھکانے کے بارے میں ہرگز نہیں بتلائیں گے۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور چاروں کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ آخر وہ وہاں سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

"یہ تو ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ ان کا باس تو کوئی پرانا مجرم ہے۔" اکرام نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ ہم اس مرتبہ ایک کیس میں الجھے ہوتے ہیں یا دو کیسوں میں۔ کیا سر کوٹلی والا اور امجد لائے کریم کی خودکشیوں کے معاملہ کا تعلق بھی ان لوگوں کے باس سے ہے؟"

"اس کا زبردست امکان ہے۔ کیونکہ ابا جان امجد لائے کریم کے ہاں جا رہے تھے اور اس کے بعد ان کا ارادہ سر کوٹلی والا کے ہاں جانے کا تھا۔ عین اس وقت یہ پانچوں بیچ میں آ کودے۔ یہی نہیں، ان کا باس بھی ان کے پیچھے وہاں پہنچ گیا۔ گویا ان کا باس کسی صورت بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ابا جان امجد لائے کریم کی لاش کو دیکھیں، یا سر کوٹلی والا کو بچا سکیں۔ لہٰذا انکل! آپ ان پانچوں کو کمرۂ امتحان میں لے جائیں اور ان سے اگلوانے

کی کوشش کریں کہ ان کے باس کا ٹھکانا کہاں ہے اور ہم ذرا اس
نجومی سے دو دو باتیں کر آئیں۔"

"اچھی بات ہے، جیسے تمہاری مرضی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ اس عمارت کی طرف روانہ ہو گئے، جس
کے ایک کمرے میں نجومی نے اپنا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ انسپکٹر جمشید
نے اس کا پتا بھی انہیں بتایا تھا۔ دفتر کے باہر انہیں چند کرسیاں
بچھی نظر آئیں — ان میں سے صرف ایک پر ایک آدمی بیٹھا تھا — وہ
بہت پریشان دکھائی دیتا تھا — تینوں خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"خیر تو ہے جناب، آپ بہت پریشان دکھائی دیتے ہیں۔" محمود
سے رہا نہ گیا —

"جی، جی ہاں۔" وہ چونکا۔

"آپ نجومی صاحب سے اپنی پریشانی کا حل معلوم کرنے آئے
ہیں؟" فرزانہ بھی بول پڑی۔

"جی ہاں، اندر کوئی صاحب گئے ہوئے ہیں۔ وہ فارغ ہو
جائیں تو میری باری آئے گی۔"

"لیکن آخر آپ کو ایسی کیا پریشانی ہے؟"

"نجومی صاحب کا خیال ہے کہ میں کچھ دنوں تک خودکشی
کر لوں گا۔ میں خودکشی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے اب میں ان کے
پاس حاضر ہوا ہوں، شاید کوئی ایسی ترکیب بتا دیں جس سے میں

خودکشی نہ کروں۔"

انہوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر محمود نے
چونک کر پوچھا:

"تو کیا آپ پہلے بھی ان کے پاس آئے تھے؟"

"جی نہیں، یہی میرے ہاں آئے تھے — ایک دن آئے اور
بتایا کہ میرا کتا ہلاک ہو جائے گا اور پھر سچ مچ ایک دن کتا مر
گیا، پھر ایک دن آئے اور بتایا کہ میرے گھر میں ایک سانپ نکل
آئے گا، لیکن گھر کے افراد اس سے محفوظ رہیں گے۔ سانپ مارا جائے
گا؛ چنانچہ گھر میں سانپ بھی نکل آیا — میرا ملازم بہت بہادر ہے۔
اس نے سانپ کو مار ڈالا — تیسری مرتبہ اس نے آ کر بتایا کہ میں خود
کشی کر لوں گا — اب میں فکرمند ہوں کہ کہیں اس کی یہ بات بھی نہ
پوری ہو جائے۔"

"اوہ —" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا — یہ بالکل ویسے
ہی حالات تھے جو سر کوٹلی والا کو پیش آئے تھے اور اس کا مطلب
ہے کہ امجد لے کریم کے ساتھ بھی تقریباً یہی کچھ ہوا تھا۔

"آپ کا نام کیا ہے جناب، شاید ہم بھی آپ کی کچھ مدد
کر سکیں۔"

"میرا نام سیٹھ عابد ہے — شاید آپ نے میرا نام سنا ہو گا۔"

"اوہ، جی ہاں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ تو حکومت

کے خاص آدمی ہیں، بلکہ کئی مرتبہ الیکشن میں بھی حصہ لے چکے ہیں۔"
محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔ صدر صاحب سے میرے خاص قسم کے تعلقات ہیں، اور بھی بڑے بڑے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔" اس نے بتایا۔

"آپ نے آج کا اخبار تو پڑھا ہوگا۔" فرزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ہاں، پڑھ چکا ہوں۔"

"اس میں سر کوٹلی والا اور امجد اے کریم کے بارے میں جو کچھ چھپا ہے، وہ بھی آپ پڑھ چکے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔"

"تو کیا آپ یہی خبریں پڑھ کر یہاں آئے ہیں۔" فرزانہ نے پر زور لہجے میں کہا۔

"آپ — آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ اب اس نے بھی ان کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔

"آپ میرا مشورہ مانیں اور فوراً ہسپتال چلے جائیں۔ اخبار کی خبریں انہیں دکھا کر انہیں بتا دیں کہ آپ کی کیفیت بھی بالکل اسی قسم کی ہے۔ وہ آپ کے دونوں ہاتھ بستر سے باندھ دیں گے اور آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے بھی رکھیں گے۔ پسند کریں تو صدر مملکت

کو بھی فون کر دیں۔ آپ کی جان بچنے کی بس یہی صورت ہے، ورنہ آپ کے ہاتھ خود بخود گلے کی طرف بڑھتے جائیں گے اور پھر گلے پر جم جائیں گے۔ سر کوٹلی والا اور امجد اے کریم کے ساتھ بھی بالکل یہی ہوا ہے — ان دونوں حضرات کو بھی اسی نجومی نے خودکشی کے بارے میں بتایا تھا، لہٰذا اس کے پاس اندر جانے کی بجائے آپ ہسپتال چلے جائیں — ہم آپ کو غلط مشورہ نہیں دے رہے — یہ شخص آپ کو بچائے گا نہیں، بچانے کی کوشش بھی نہیں کرے گا، کیونکہ یہی تو وہ شخص ہے جو لوگوں کو اس عجیب و غریب طریقے سے موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔ ہم پر یقین کیجیے۔"

"تم — تم کون ہو؟" سیٹھ عابد نے بوکھلا کر کہا۔

"ہم انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں — وہ بھی اس وقت انہی لوگوں کی وجہ سے ہسپتال میں پڑے ہیں۔"

اسی وقت دفتر کا بند دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک آدمی چندھیائی ہوئی آنکھوں والا نکلا — اس نے اندھوں کی طرح سامنے دیکھا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ انہوں نے دیکھا وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس کا شمار بہت ہی نیک لوگوں میں ہوتا تھا۔ شہر کے بہت بڑے بڑے خیرات کرنے والوں میں اس کا نام سب سے پہلے لیا جاتا تھا۔ اس کا نام حامد سرفراز خان تھا۔ اس کی طرف سے رخ پھیر کر وہ سیٹھ عابد کی طرف مڑے۔ وہ حیرت بھری نظروں سے

حامد سرفراز کو تکے جا رہا تھا۔

"اف خدا، انہیں جانتے ہیں آپ لوگ۔ یہ۔ یہ حامد سرفراز خان ہیں. ملک کی اہم ہستی۔" سیٹھ عابد نے کپکپاتی آواز میں کہا.

"جی ہاں، ہم انہیں جانتے ہیں. ایسا معلوم ہوتا ہے، اس نجومی نے صرف اہم ترین شخصیتوں کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کر رکھا ہے، آپ نے کیا سوچا ہے۔ آپ ہمارے مشورے پر عمل کر رہے ہیں یا اندر جائیں گے۔"

ابھی محمود کے الفاظ درمیان میں ہی تھے کہ دروازے پر لگی گھنٹی دو بار بجی۔ یہ اشارا تھا اس بات کا کہ اگر کوئی اور شخص باہر موجود ہو تو اندر آ سکتا ہے. سیٹھ عابد نے ایک نظر ان پر ڈالی اور دوسری دروازے پر۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے. اندر جائے یا ان کے مشورے پر عمل کرے. آخر اس نے کانپ کر کہا:

"میں۔ میں اندر نہیں جاؤں گا، میں ہسپتال جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ بیرونی دروازے کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔

"فاروق، اندر صرف میں اور فرزانہ جائیں گے. تم انکل اکرام کو فون پر سارے حالات بتا دو اور یہ بھی کہ وہ جلد از جلد حامد سرفراز خان کو بچانے کی کوشش کریں اور انہیں بچانے کی بس

یہی ایک صورت ہے جو ہم نے سیٹھ عابد کو بتائی ہے۔ آؤ فرزانہ۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔ اور پھر فرزانہ کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ فاروق بھی تیزی سے حرکت میں آیا۔ عمارت میں پبلک فون بوتھ موجود تھا۔

محمود اور فرزانہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئے۔ اس کمرے میں کوئی نہیں تھا. شاید دفتر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ دیواروں پر بڑی بڑی خوف ناک قسم کی تصاویر آویزاں تھیں۔ وہ آگے بڑھے تو ایک دوسرے کمرے کا دروازہ نظر آیا. موٹے قالین پر چلتے ہوئے وہ دوسرے کمرے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوگئے.

سامنے دیوار کے ساتھ ایک بھاری اور اونچی کرسی رکھی تھی. اس کرسی میں ایک پتلا دبلا آدمی دھنسا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ تھا۔ سر انڈے کے چھلکے کی طرح تھا۔ یعنی اس پر ایک بال بھی نہیں تھا۔ آنکھیں سرخ اور باہر کو اُبلی ہوئی تھیں۔ اس نے انہیں حیرت بھری نظر سے دیکھا اور بولا:

"کیا آپ اپنے مستقبل کے بارے میں معلوم کرنے آئے ہیں؟"

"جی نہیں۔" محمود بولا۔

"تو پھر کس لیے آئے ہیں؟"

"آپ کے مستقبل کے بارے میں معلوم کرنے آئے ہیں۔" فرزانہ

مسکرائی۔

"کیا مطلب؟"

"میرے جملے میں ایک بھی مشکل لفظ موجود نہیں اور آپ اردو جانتے ہیں۔" فرزانہ نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"میرے مستقبل کی آپ کو کیوں فکر ہے۔" اس نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ کو بھی تو دوسروں کے مستقبل کی فکر رہتی ہے۔" محمود ہنسا۔

"تم دونوں چاہتے کیا ہو؟" اب اسے غصہ آگیا۔

"تمہاری صورت دیکھنا چاہتے تھے، تمہاری آواز بھی سننا چاہتے تھے۔۔۔ سر کوٹھی والا اور امجد لے کریم کے قاتل کو دیکھنا چاہتے تھے اور ابھی تو نہ جانے اور کتنے بڑے آدمی خودکشی کرنے والے ہیں۔۔۔ اب ان بے چاروں کو کیا معلوم، یہ سب کیا دھرا نجومی صاحب کا ہے۔"

"کیا آپ لوگ پاگل ہیں؟" اس نے چیخ کر کہا۔

"ہم پاگل نہیں، تمہیں ضرور پاگل کر دیں گے۔ ہم وہ ہیں، جن کے والد کو تم نے اپنے غنڈوں کے ذریعے اس حالت کو پہنچا دیا ہے کہ وہ ہسپتال میں پڑے ہیں۔ اگر اب بھی نہیں سمجھے تو سن لو، ہمارے نام محمود اور فرزانہ ہیں۔۔۔ فاروق دروازے سے باہر

موجود ہے۔ تاکہ ہم خطرے میں گھر جائیں تو وہ حرکت میں آسکے۔ تم نے تو ہم تینوں کو بھی اسی حالت کو پہنچانے کا حکم دے دیا تھا، لیکن افسوس تمہارے پانچوں غنڈے اس مرتبہ وہ کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ نتیجے کے طور پر اب محکمہ سراغرسانی کے کمرۂ امتحان میں ہیں۔ اب اگر تم یہ پوچھو گے کہ کمرۂ امتحان کا کیا مطلب ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ وہ کمرہ بھی کسی نجومی کے کمرے سے کم نہیں ہو سکتا۔" فرزانہ طنزیہ انداز میں رکے بغیر کہتی چلی گئی۔

"تم لوگ ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں ایک سیدھا سادا نجومی ہوں، میرا کسی جرائم پیشہ آدمی سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اور تم لوگوں کو خودکشی پر مجبور بھی نہیں کرتے۔" محمود نے تلملا کر کہا۔

"اس دنیا میں بھلا کوئی شخص کسی کو خودکشی پر بھی مجبور کر سکتا ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں، ہپناٹزم سے کام لے کر۔۔۔ یا کسی اور علم کے ذریعے سے ایسا کام لیا جا سکتا ہے۔" محمود نے کہا۔

"لیکن میں ہپناٹزم نہیں جانتا، اگر یقین نہیں تو کسی ہپناٹزم کے ماہر کو یہاں لے آؤ۔ وہ مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد بتا دے گا کہ میں ہپناٹزم کا ماہر نہیں ہوں۔"

"خیر خیر، دیکھا جائے گا۔ آؤ فرزانہ چلیں۔" محمود نے مڑتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے، آپ تو بیٹھے بھی نہیں۔"

"بیٹھ کر کیا کریں گے۔ ہم صرف اس ملک کے خیر خواہوں کے ساتھ بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔" محمود نے کہا اور فرزانہ کا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف مڑ گیا۔

دونوں باہر نکلے تو فاروق کو کرسی پر بیٹھے پایا۔

"کیوں کیا رہا؟" اس نے پوچھا۔

"ملاقات دل چسپ رہی، لیکن ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ دل کہتا ہے، خودکشی والے کیس اور ابا جان کو اس حالت کو پہنچا دینے کا ذمہ دار یہی شخص ہے۔"

"تب تو ہمیں اس کی نگرانی کرنا ہوگی۔" فاروق بولا۔

"جو شخص یہاں بیٹھے لوگوں کو خودکشی پر مجبور کر سکتا ہے۔ اس کی نگرانی سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بھلا۔" فرزانہ نے کہا۔

"ایسا شخص یہ حرکات بغیر کسی وجہ کے تو کر نہیں رہا اور اس وجہ کی خاطر اسے بھی کچھ کرنا پڑتا ہوگا، لہٰذا ہم اس کی نگرانی کر کے ہی کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔" فاروق نے فرزانہ کے اعتراض کا جواب دیا۔

"فرزانہ، فاروق ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"ہوں، میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔ تو پھر، اب کیا پروگرام ہے؟"

انہوں نے دروازے پر دفتر کے اوقات کی تختی دیکھی۔ اس کی رو سے صرف چند منٹ بعد دفتر کا ٹائم ختم ہونے والا تھا۔

"ہم یہ کام اسی وقت سے شروع کریں گے۔" محمود بولا۔

"ٹھیک ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

لیکن نجومی کے تعاقب سے انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ وہ دفتر سے سیدھا اپنے گھر گیا اور پھر شام تک باہر نہیں نکلا۔ آخر وہ مایوس ہو کر وہاں سے ہٹ آئے اور اکرام کو فون کیا۔ اس نے ان کی آواز سنتے ہی کہا۔

"ہیلو، ایک حوصلہ افزا خبر سنو، ان پانچ میں سے ایک کمزور ثابت ہوا ہے۔ اس نے باس کا ٹھکانا بتانے کی حامی بھر لی ہے۔ یہ بات اس نے علیحدگی میں بتائی ہے اور یہ وعدہ لیا ہے کہ ہم اس کے ساتھیوں کو نہیں بتائیں گے۔"

"چلیے ٹھیک ہے، ہمیں اور کیا چاہیے۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"اس کی ایک شرط اور ہے۔" اکرام بولا۔

"اور وہ کیا ہے؟"

"وہ دن کے اجالے میں باس کا گھر دکھانے نہیں جائے گا۔"

"ہمیں اس کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ ہم اسے رات کے نو بجے

کے بعد سے کر چلیں گے۔" محمود بولا۔

"یہ پروگرام ٹھیک رہے گا۔"

اکرام کے ریسیور رکھنے کے بعد محمود نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ فاروق اور فرزانہ بھی کان قریب رکھ کر یہ گفتگو سن چکے تھے۔

"اب اگر اس کا دکھایا ہوا ٹھکانا نجومی کا گھر ثابت ہوا تو مزا ہی آجائے گا۔" محمود ان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ مزا آئے گا یا نہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تو تم اپنی زبان بند رکھو، اگر نہیں کہا جا سکتا۔" فرزانہ نے اس سے بھی برا منہ بنایا اور محمود ہنس پڑا، جس پر فاروق اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

"اور اگر وہ گھر نجومی کا ثابت نہ ہو سکا تو پھر ہم نجومی کو کس خانے میں فٹ کریں گے۔" فرزانہ نے چند سیکنڈ بعد کہا۔

"کوئی نہ کوئی خانہ ڈھونڈ ہی لیں گے۔ کیا خیال ہے، اس موقع پر ابا جان سے مشورہ نہ کر لیا جائے۔" محمود کو جیسے اچانک خیال آیا۔

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔ انہوں نے یہ کہا بھی تھا کہ ان حالات میں وہ سوائے مشورہ دینے کے کچھ نہیں کر سکتے۔" فرزانہ بولی اور محمود نے ایک بار پھر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو ابا جان، اب آپ کا کیا حال ہے؟"

"پہلے سے بہت بہتر ہے۔ تم سناؤ، کیا رپورٹ ہے؟"

"جی عرض کرتا ہوں۔"

اس نے مختصر الفاظ میں ساری بات انہیں بتادی اور آخر میں پوچھا:

"اب ہم نو بجے اس غنڈے کے ساتھ باس کے گھر جانا چاہتے ہیں۔"

"کیا تم پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں پڑھ چکے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں، لیکن ان دونوں نے تو خودکشی کی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ خودکشی پراسرار حالات میں کی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں ہپناٹزم کیا گیا ہو۔"

"سب سے زیادہ ضروری کام یہی تھا، پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں پڑھنا۔ خیر، یہ کام اب بعد میں کر لینا۔ پہلے باس کے گھر ہو آؤ، لیکن محتاط رہنا، دشمن کچھ زیادہ ہی خطرناک ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔"

اس نے فون رکھا ہی تھا کہ اکرام پورے عملے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

"انکل، کیا آپ پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں دیکھ چکے ہیں؟"

"ہاں، کیوں کیا بات ہے؟"

"اس میں کوئی خاص بات؟" محمود نے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔ دونوں کی موتیں گلا گھٹنے سے ہی ہوئی ہیں۔"

"پھر، آخر ابا جان پوسٹ مارٹم کی رپورٹوں پر اتنا زور کیوں دے رہے تھے۔" فرزانہ نے چونکے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" اکرام چونکا اور انہوں نے اپنے والد سے فون پر ہونے والی گفتگو دہرا دی۔

"خیر، دیکھا جائے گا۔ آؤ پہلے باس سے نبٹ لیں۔"

عین اسی وقت فون کی گھنٹی گنگنا اُٹھی۔

پروگرام کیا تھا؟

"یہ میرا فون ہو گا۔ میں دفتر میں بتا کر آیا تھا کہ پہلے میں ادھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو، میں اکرام بول رہا ہوں، کیا۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر اسی حالت میں اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"خیر تو ہے انکل۔" محمود نے گھبرا کر پوچھا۔

"حامد سرفراز خان نے بھی بالکل اسی انداز میں خودکشی کر لی ہے۔ سیٹھ عابد ہسپتال کے بستر پر لیٹے اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ ہاتھ کسی طرح گلے تک لے جا سکیں، لیکن چونکہ ڈاکٹروں نے ان کے دونوں ہاتھ چمڑے کے تسموں سے جکڑ رکھے ہیں، اس لیے وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے؛ تاہم ان کی کوشش بدستور جاری ہے۔ ڈاکٹر ان کا معائنہ کر رہے ہیں اور حد درجے پریشان ہیں۔ اب انہوں نے سوچا ہے کہ انہیں بے ہوشی کا انجکشن دے

دیا جائے۔"

"ہاں، یہی مناسب رہے گا — یہ لمحات گزر جائیں تو پھر شاید وہ اپنے ہوش و حواس میں آ جائیں گے۔" فرزانہ نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"اف، آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔" فاروق نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"کوئی بہت ہی ذہین دماغ ہمارے ملک کی اہم ترین ہستیوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔" محمود بولا۔

"لیکن کیوں، اسے ان سے کیا دشمنی ہے۔ کیا وہ شخص ہمارے ملک کا دشمن ہے۔" فرزانہ تقریباً چیخ کر بولی۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ خودکشی کی یہ تینوں وارداتیں اپنی نوعیت کی انوکھی ترین وارداتیں ہیں۔" اکرام نے کہا۔

"اوہ، انکل ہمیں سب سے پہلے حامد سرفراز کی لاش کا معائنہ کرنا چاہیے۔ دیکھیں تو سہی، ان کی ہنسلی کی ہڈی پر بھی وہ سرخ نشان ہے یا نہیں۔" فرزانہ نے خیال دلایا۔

"بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ تو پھر پہلے ادھر ہی چلتے ہیں۔"

حامد سرفراز خان کی ہنسلی کی ہڈی پر بھی بالکل ویسا ہی نشان تھا، جب کہ گھر کے افراد کا کہنا تھا کہ یہ نشان انہوں نے ان کی

زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

"انکل فوری طور پر پوسٹ مارٹم کے ماہرین کو بلائیں۔ مجھے ایک بات بہت دیر سے کھٹک رہی ہے۔" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔ اکرام نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس نے فرزانہ کی آنکھوں میں نہ جانے کیا دیکھا کہ خود بخود ہاتھ فون کے ریسیور کی طرف بڑھ گئے۔

"اور ساتھ ہی ان سے یہ بھی معلوم کریں کہ سر کوٹلی والا اور امجدالے کریم کی ہنسلی کی ہڈیوں پر جو نشانات تھے وہ اب بھی ہیں یا نہیں۔"

اکرام نے پھر فرزانہ کو حیران ہو کر دیکھا۔ اس مرتبہ تو محمود اور فاروق نے بھی اسے گھورا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔ تھوڑی دیر بعد اکرام ان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"ان دونوں کی ہڈیوں پر اب وہ نشان نہیں ہیں۔"

"بہت خوب، یہ ہوئی نا بات۔" فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

"کیا بات ہوئی۔ ہمارے تو کچھ پلے نہیں پڑا۔" فاروق نے جل بھن کر کہا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔" فرزانہ پر جوش لہجے میں بولی۔

"کیا دیکھتے جائیں تمہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہاں مجھے ہی دیکھتے جاؤ اور تمہیں کیا نظر آ سکتا ہے۔"

اسی وقت ماہرین آ گئے۔ فرزانہ نے ان سے کہا:

"میں چاہتی ہوں، ان کا فوری طور پر پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ اس نشان کے غائب ہونے سے پہلے پہلے چاہے آپ یہیں پوسٹ مارٹم شروع کر دیں۔"

"یہاں تو نہیں ہو سکے گا۔ ہاں ہم فوری طور پر نعش کو لے جاتے ہیں اور اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔"

"چلیے یونہی سہی۔ معدہ اور آنتیں خاص طور پر چیک کرنی ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔"

اور وہ تینوں فرزانہ کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔

"آج تو تم بالکل ابا جان کی نقل اتار رہی ہو۔"

"نقل کام چور اتارا کرتے ہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"کیا تم مجھے اور محمود کو کام چور کہہ رہی ہو؟"

"نہیں تو، کیا تم نقل کرتے ہو۔" فرزانہ نے شوخ آواز میں کہا۔

"آخر تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ تم نے معدہ اور آنتیں خاص طور پر چیک کرنے کے لیے کیوں کہا ہے؟"

"بس دیکھتے جاؤ۔"

"دھت تیرے کی۔ پھر وہی دیکھتے جاؤ۔" فاروق نے جھلا

کر کہا۔

"ہائیں ہائیں، تم محمود تو نہیں ہو۔" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"تم نے بھی تو دو تین دن سے دھت تیرے کی نہیں کہا۔" فاروق بولا۔

ایک گھنٹے بعد رپورٹ موصول ہوئی۔ اس بار پوسٹ مارٹم نشان غائب ہونے سے پہلے کر لیا گیا تھا۔ حامد سرفراز خان کے معدے اور آنتوں میں کسی زہر کے آثار پائے گئے تھے۔

"تو میرا خیال ٹھیک تھا۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"اب ہمیں کیا معلوم کہ تمہارا خیال کیا تھا۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"ان لوگوں کو پہلے کوئی زہر دیا جاتا ہے۔ وہ زہر آہستہ آہستہ اثر کرتا ہے اور جب اس کا اثر مکمل ہوتا ہے تو زہر کھانے والے کے ہاتھ اپنے گلے پر جم جاتے ہیں۔ جانور وغیرہ بھی شاید اسی زہر سے ہلاک کیے جاتے ہیں۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

اس بات کی تصدیق سیٹھ عابد کریں گے، کیونکہ وہ مرنے سے بچ گئے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر چلو، اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

آخر وہ تارے اور گنگو تیلی کے ساتھ باس کے گھر

تک پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ وہ گھر نجومی والا نہیں تھا۔ یہ مکان شہر سے باہر درختوں کے درمیان تھا اور بہت بڑا معلوم ہوتا تھا۔ وہ درختوں کی اوٹ لے کر ہی اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اپنی جیپیں انہوں نے بہت دُور چھوڑ دی تھیں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے کئی کاریں اس مکان کے سامنے آ کر رکیں۔

"یہاں تو شاید کچھ لوگ جمع ہو رہے ہیں" فرزانہ بولی۔

"ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"

ان کے نزدیک پہنچنے تک چار پانچ کاریں اور وہاں آ موجود ہوئیں۔ انہوں نے دیکھا، ان میں سے کئی کئی آدمی اتر کر مکان کے اندر چلے گئے۔

"انکل، یہاں تو کچھ زیادہ ہی آدمی جمع ہوتے نظر آتے ہیں۔ کہیں ہم پھنس نہ جائیں"

"تو میں وائرلیس کیے دیتا ہوں۔ پورا ایک دستہ اس مکان کو گھیر لے گا"

"ابھی ٹھہریں، پہلے سب لوگوں کو آنے دیں"

آدھ گھنٹے تک کاروں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر رک گیا۔ پھر اکرام نے وائرلیس کیا۔ بیس منٹ کے اندر دستہ پہنچ گیا۔ اکرام نے اسے ہدایات دیں اور ان تینوں کے ساتھ دروازے

کی طرف بڑھا۔ وہ بے دھڑک اندر گھس گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک ایک پستول تھا اور بس۔ اکرام کے دوسرے ہاتھ میں سیٹی ضرور تھی۔

انہوں نے دیکھا، وہ ایک بہت بڑے ہال میں کھڑے تھے۔ اس ہال میں تقریباً ساٹھ آدمی موجود تھے۔ سب کے سب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سامنے کی کرسی پر ایک پتلا دبلا آدمی شاہانہ لباس پہنے بیٹھا تھا۔ ان کے اندر داخل ہونے کا کسی کو بھی پتا نہ چلا، کیونکہ سب کے سب اس پتلے دبلے آدمی کی طرف دیکھ رہے تھے اور خود وہ ان میں سے ایک کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا:

"آپ جو چاہتے تھے، ہم نے شروع کر دیا ہے۔ بہت جلد ہم آپ کے راستے کے پتھر صاف کر دیں گے"

اس کی آواز سن کر ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ آواز اس نوجوان کی تھی، جو ان کے گھر پنکچر لگوانے آیا تھا۔ ان کی حیرت یک لخت بہت بڑھ گئی، کیونکہ جس آدمی سے اس نے یہ بات کہی تھی، وہ بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ سابقہ حکومت کا ایک بہت بڑا لیڈر رانا بہادر تھا اور موجودہ حکومت کے خلاف ایک عرصے سے خفیہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ توڑ پھوڑ، بموں کے دھماکے کرانا تو اس کا روز کا معمول تھا۔ حکومت اس کے

بے شمار آدمیوں کو گرفتار کر چکی تھی، لیکن اس کی کارروائیوں میں
ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی
تک یہ خود گرفتار نہیں ہوا تھا۔

"میرے یہ سب آدمی اس کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔"
سیاسی لیڈر رانا بہادر نے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ میں نے اس شہر میں ایک مشہور نجومی
کی خدمات حاصل کر کے یہ کام شروع کیا ہے۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ
آپ کا گہرا دوست ہے اور آپ نے اسے میرے بارے میں سب
کچھ بتا رکھا ہے۔ اس لیے میں نے اس کی مدد سے کچھ قاتلوں کو رہا
کرایا ہے اور ان سے کام لے رہا ہوں۔ نجومی کو میں نے ایک
خاص قسم کا زہر دے رکھا ہے۔ وہ ان تمام مشہور ہستیوں کو اپنے
علم نجوم کے رعب میں لے کر ملاقات کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔
اور پھر وہ سکون کی دوا کے طور پر اپنے دفتر میں ہی انہیں اس
زہر کی ایک خوراک کھلا دیتا ہے۔ اس زہر کا کام یہ ہے کہ
آہستہ آہستہ اپنا اثر کرتا ہے اور تین یا چار روز بعد زہر کھانے
والا اپنے ہاتھ خود بخود گلے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ
گلے پر جم جاتے ہیں۔ دراصل زہر گلے میں کچھ ایسی تکلیف پیدا کرتا
ہے کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا دبا لیتے ہیں اور لوگ یہ
خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے خودکشی کی ہے۔ پیشین گوئیاں ملازموں

کو رشوت دے کر پوری کراتا رہا ہوں۔"

"انسپکٹر جمشید سے کیوں جھگڑا مول لیا گیا۔" رانا بہادر نے
پوچھا۔

"آپ کو معلوم ہی ہے۔ میں یورپی ممالک میں جرائم پیشہ لوگوں
کے ساتھ رہ کر آیا ہوں۔ یہ زہر بھی میں وہیں سے لایا تھا۔ زہر
کھانے والے کی ہتھیلی کی ہڈی پر مرنے سے کچھ لمحات پہلے ایک
سرخ نشان ابھرتا ہے، جو مرنے کے کچھ دیر بعد تک رہتا ہے۔
امجد اے کریم مرنے سے پہلے کاغذ پر انسپکٹر جمشید کا نام لکھ
گئے تھے اور سر کوٹلی والا تو خود ہی اس سے ملنے چلے گئے تھے۔
امجد اے کریم کی موت کے بعد انسپکٹر جمشید اس کی لاش کا
معائنہ کرنے اس کے گھر کا رخ کر چکے تھے۔ ایسے میں میں
دخل نہ دیتا اور غنڈوں کو اس کے پیچھے نہ لگا دیتا تو وہ اس
نشان کو ضرور دیکھ لیتا اور پھر سر کوٹلی والا کی لاش پر ویسا ہی
نشان دیکھ کر ضرور چونک اٹھتا۔ اس لیے یہ کام کیا گیا۔ وہ بھی
انتقام کے نام پر۔"

"لیکن تم خود اس کے گھر کیوں گئے تھے۔" رانا بہادر نے
پوچھا۔

"او ہو، تو آپ بھی میری نگرانی کراتے رہتے ہیں۔ میں اس
بات کو پسند نہیں کرتا۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"آیندہ تمہاری نگرانی نہیں کرائی جائے گی۔ اس وقت تو تمہاری جانچ پڑتال کی گئی ہے۔"

"چلیے خیر اس کے گھر میں اس لیے گیا تھا کہ ان کے بچوں کو کچھ دیر تک جائے واردات تک نہ جانے دوں، لیکن میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لیے میں نے سوچا، ان کی بھی مرمت ضروری ہے، لیکن انہوں نے اپنے مکان میں میرے غنڈوں کو شکست دے دی۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ میں ان سے بھی سمجھ لوں گا اور اپنے غنڈوں کو بھی چھڑا لوں گا۔ سپرنٹنڈنٹ کس دن کام آئے گا۔"

تمام باتیں صاف ہو چکی تھیں۔ اس لیے محمود نے اکرام کو اشارا کیا کہ وہ اپنے دستے کو اندر ہی لے آئے۔ وہ دبے پاؤں باہر نکل گیا اور عین اسی وقت نوجوان کی نظر ان تینوں پر پڑی۔ اس کا منہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہائیں، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" اس کے منہ سے نکلا۔ اس کے الفاظ پر دوسروں نے بھی ان کی طرف دیکھا۔

"آپ ہمیں دیکھ رہے ہیں جناب، اور کچھ بھی نہیں دیکھ رہے۔ آپ ہم سے سمجھنا چاہتے ہیں نا، تو لیجیے، ہم حاضر ہو گئے ہیں۔ کیا سمجھنا چاہتے ہیں، یہ خود بتا دیں، لیکن میں بھی آپ کو اتنا بتا دوں کہ الجبرا سمجھنے کی فرمائش نہ کر بیٹھیے گا، ورنہ

ہماری بہن کو غصہ آ جائے گا اور نہ ہی جغرافیہ۔ یہ ذرا مجھے گراں گزرتا ہے۔ محمود حساب سے گھبراتا ہے۔ ان تین مضامین کے علاوہ ہم ہر چیز آپ کو سمجھا دیں گے۔" فاروق شوخ انداز میں کہتا چلا گیا۔

"یار ٹر ٹر نہ کرو۔" محمود نے جھلا کر کہا: "اگر فرزانہ الجبرے میں کمزور ہے تو وہ میں انہیں سمجھا سکتا ہوں۔ تم اگر جغرافیے میں کمزور ہو تو وہ فرزانہ انہیں سمجھا سکتی ہے اور اگر میں حساب میں کمزور ہوں تو وہ انہیں تم سمجھا سکتے ہو۔"

"واہ، ترکیب تو یہ بھی شاندار ہے۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"تو تمہاری موت نے تمہیں ادھر بھیج ہی دیا ہے۔" نوجوان غرایا۔

"ہاں، ملی تو تھی راستے میں۔ آتی ہی ہوگی۔" فاروق بولا۔

اسی وقت اکرام اپنے ماتحتوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں۔

"ان مشین گنوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کی زبان تو آپ سمجھتے ہی ہوں گے۔ مکان بھی پورا کا پورا گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔ کیوں کیسی رہی؟"

سب کے سب ساکت رہ گئے۔ ہتھیار نکالنے کی حسرت

ان کے دلوں میں ہی رہ گئی اور پر سکون انداز میں ان کی گرفتاری مکمل ہوگئی — بعد میں نجومی اور سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

تینوں وہاں سے سیدھے ہسپتال پہنچے۔ انسپکٹر جمشید ہوش میں تھے۔ انہیں دیکھ کر چونک اٹھے — پھر ان کے چہروں کو غور سے دیکھتے ہوتے بولے:

"تو تم معاملہ نبٹا آئے ہو۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"تمہارے چہرے پڑھ کر۔" وہ مسکرائے۔

"اب تو مجھے بھی ایک بات معلوم ہوگئی ہے۔"

"اور وہ کیا؟" بیگم جمشید بولیں۔

"یہ کہ ہم تینوں کے تینوں چہرے پڑھنے میں بہت کمزور ہیں۔"

اس کا جملہ سن کر محمود اور فرزانہ مسکرانے لگے — کیونکہ تھوڑی دیر پہلے مجرموں سے اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی —

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز

مصنف: اشتیاق احمد

- انسپکٹر جمشید کا ایک دوست غائب تھا۔
- ہوٹل کے ہال میں ایک انتہائی لمبا آدمی داخل ہوا اور پھر....
- اور پھر ایک ہنگامہ شروع ہوگیا۔
- اس ہنگامے نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
- ان کا دوست شہر میں کہاں تھا، کیا کر رہا تھا؟
- ایک انتہائی پر اسرار اور خوف ناک آدمی، جس کی سارے شہر پر حکومت تھی۔

قیمت : ۵/۵۰

نوٹ: یہ ناول دو حصوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے کا نام "شہر کے قیدی" ہے۔

دشمن شہر کا دوسرا حصہ

آیندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۷۹

شہر کے قیدی

— مصنف : اشتیاق احمد —

- مونطاف کون تھا۔ کیا وہ اس کی شخصیت سے پردہ اٹھا سکے؟
- ان کے لیے شہر سے نکلنے کے تمام راستے بند تھے —
- انسپکٹر جمشید نے ایک گیراج نما کمرے کا دروازہ کھولا اور دھک سے رہ گئے۔
- اس شخص کی کہانی جو بے شمار پردوں میں چھپا ہوا تھا —
- انہوں نے اس کا سراغ کس طرح لگایا؟

آپ اس مرتبہ کرداروں کو جاسوسی کی نئی راہ پر پائیں گے

قیمت : ۵/۵۰